جلد: ۶۲
عدد ۳، ۴

نومبر
دسمبر ۶۴ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعتِ خاص

قیمت فی پرچہ: ۱/۵۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات ختم ہو گئے ہیں اور وہ لوگ منتخب ہو چکے ہیں جنہیں انتخابی ادارہ کے ارکان کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں اور صدرِ مملکت کے انتخاب کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ مستقبل میں حالات کا دھارا کس رُخ بہنے والا ہے اس کے متعلق کوئی بات بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ ہم مالک الملک کے حضور میں دست بدعا ہیں کہ وہ اس ملک کے باشندوں، ان کے منتخب نمائندوں، اور اربابِ حکومت کو اخلاص، دیانت اور فہم و تدبر عطا کرے تاکہ وہ مل جُل کر ملّت کو اُس راستہ پر ڈال دیں جس پر چل کر پاکستان کے وجود کے حقیقی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

جس روز سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے آمرانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لیے اور پھر اپنے آئینی حدود سے صریح تجاوز کر کے بالآخر مجلس دستور ساز کو توڑا، وہ دن ملک کے لیے سب سے زیادہ منحوس تھا۔ اس کے بعد سیاست باز سرکاری افسروں کے مختصر سے گروہ کی دراز دستیاں بڑھتی چلی گئیں اور انہوں نے آئین و قوانین اور ساری جمہوری روایات کو نظر انداز کر کے ملک پر بے غل و غش آمریت مسلط کر دی۔ ان چند سالوں میں عوام کے شہری حقوق کو جس طرح پامال کیا گیا ہے یہ ایک بڑی دلفگار داستان ہے جسے اس ملک کا ہر فرد پوری طرح جانتا ہے۔ اس لیے ہم اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہم ان تازہ انتخابات کے بارے میں چند معروضات پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کے جائزے ہی سے اس صورتِ حال کا ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے

جس سے اس وقت ہمارا ملک دوچار ہے اور پھر ان حقائق کی روشنی ہی میں مستقبل کی تعمیر کے لیے کوئی صحیح لائحۂ عمل تیار ہو سکتا ہے۔

انتخابات کی غرض و غایت، جیسا کہ گزشتہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے، صرف یہی ہے کہ رائے عامہ اُبھر کر سامنے آئے اور پھر اسی رائے عامہ کو ملک میں بالادستی حاصل ہو جس سے قوم کے عزائم اُس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل ہو سکے۔ انتخابات اگر ایک طرف قوم کے ولولوں کے ترجمان ہیں تو دوسری طرف برسرِ اقتدار گروہ کی کارگزاریوں کا جائزہ بھی ہیں۔ ان سے جہاں عوامی رجحان کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حکمران طبقہ کی سابقہ کارگزاری کے بارے میں قوم کی عدالت سے کیا فیصلہ صادر ہوا ہے۔

جس طرح ایک سائنس دان ہمیشہ اپنے پیمانوں کی صحت برقرار رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس کی تحقیقات کے نتائج غلط نہ ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح دنیا کی ہر مہذب اور حقیقت پسند قوم اپنی رائے عام کو جانچنے اور پرکھنے کے معاملے میں غیر معمولی حد تک حساس اور محتاط ہوتی ہے اور اس بات کا پورا التزام کرتی ہے کہ اُس کی رائے پوری صحت کے ساتھ ظاہر ہو تاکہ قومی فلاح و بہبود کے لیے اُسے جو نقشہ مرتب کرنا ہے اُس میں کوئی سقم باقی نہ رہے۔ اگر ہوا کے رُخ کی نشاندہی کرنے والا آلہ ہی خارجی دباؤ کی وجہ سے کسی غلط سمت کی طرف اشارہ کر دے تو اس کی بنیاد پر جو قدم بھی اٹھایا جائے گا وہ لازماً غلط راستے پر لے جائے گا۔

اسی بنا پر ہر وہ قوم جو اپنے ہاں عدل و انصاف اور آئین و دستور کی حکمرانی چاہتی ہے وہ دو باتوں کا خاص طور پر اہتمام کرتی ہے۔ ایک عدلیہ کی آزادی۔ دوسرے رائے عامہ کی آزادی جو درحقیقت پوری قوم کی عدالت ہے۔ قوم کی عدالت سے مہذب اقوام یہ فیصلہ

طلب کرتی ہیں کہ اُن کے اجتماعی نظم کو کونسے ہاتھ کن مقاصد کے حصول کے لیے کس قسم کے آئین و ضوابط کے تحت چلائیں عوام کی عدالت ان بنیادی امور کا فیصلہ کر دینے کے بعد برسرِ اقتدار گروہ کی سرگرمیوں کی ہر وقت جانچ پڑتال کرتی رہتی ہے اور جہاں جہاں یہ سرگرمیاں اُسے قومی مفادات کے لیے ضرر رساں دکھائی دیتی ہیں، اُن پر گرفت کرتی ہے۔ حکومت اگر اپنے اختیارات اور ذرائع و وسائل سے کام لے کر کسی وقت عوام کی اس آزادئ انتخاب اور آزادئ تنقید میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے تو ایسی حالت میں ملکی عدالتیں آگے بڑھ کر لوگوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور ملک کے نظام کو جبر و استبداد کے راستے پر جانے سے روک دیتی ہیں۔ اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی صحت مند معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے تین قسم کی آزادیاں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ عدلیہ کی آزادی، رائے عامہ کی آزادی اور رائے عامہ کی تربیت کرنے والے ذرائع و وسائل، یعنی تحریر و تقریر اور اجتماع کی آزادی۔ دنیا کی ہر ہوشمند قوم، جو خود اپنی دشمن نہ بن چکی ہو، ان تینوں اداروں کی اپنی جان پر کھیل کر بھی حفاظت و پاسبانی کرتی ہے کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک کی آزادی پر بھی دست درازی کی جائے تو پوری قوم پر انحطاط طاری ہو جاتا ہے۔

ان بنیادی اُمور کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم بنیادی جمہوریتوں کے حالیہ انتخابات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں شدید مایوسی ہوتی ہے، کیونکہ ان میں وہ تمام تدابیر استعمال کی گئیں جن سے انتخابات کے نتائج رائے عامہ کے بالکل برعکس رونما ہو سکیں، اور ان تمام ہتھکنڈوں سے کام لیا گیا جو رائے عام کے اظہار میں مانع ہو سکتے تھے۔

صحیح انتخاب کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ لوگوں کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہو اور پریس اور پلیٹ فارم آزاد رہے تاکہ عوام کے سامنے ہر نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ آسکے اور وہ صحیح طریقہ سے رائے قائم کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن یہاں ستمبر کے تیسرے ہفتے تک تو یہ تمام

آزادیاں بالکل ہی مسلوب رہیں اور پورے زور شور کے ساتھ حکمران گروہ کا یک طرفہ پروپیگنڈا ہی ہوتا رہا۔ پھر ستمبر کے آخر میں کچھ تحریر و تقریر کی آزادی ملی بھی تو اس حال کہ پریس اور خبر رساں ایجنسیوں پر حکومت کا شدید تسلط برقرار رہا اور مخالف نقطۂ نظر کو سرکاری پروپیگنڈے کے مقابلے میں عوام کے سامنے آنے کا بہت کم موقع دیا گیا۔

صحیح انتخابات کے لیے دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستیں ایمانداری کے ساتھ بالکل درست مرتب ہوں۔ لیکن اس معاملے میں محض کوتاہی نہیں بلکہ صریح بد دیانتی سے کام لیا گیا اور ایسی ایسی دھاندلیاں کی گئیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔ بااثر لوگوں نے جان بوجھ کر فہرستوں میں بے شمار فرضی ووٹروں کے نام درج کروالیے اور پولنگ کے موقع پر اس جعلسازی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان غلط ناموں کو فہرستوں سے خارج کرانے کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ زیادہ تر ناکام ہوئیں۔ دوسری طرف بے شمار اصلی ووٹروں کے نام درج نہیں کیے گئے، یا درج ہونے کے بعد قصداً کاٹ دیئے گئے، یا ان کے نام اور ولدیت وغیرہ لکھنے میں ایسی غلطیاں کی گئیں جن سے وہ مشتبہ ہو کر رہ گئے۔ ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے بھی جن لوگوں نے کوشش کی وہ اکثر و بیشتر ناکام ہی ہوئے۔ ان چابک دستیوں پر مزید ستم یہ تھا کہ بکثرت مقامات پر رائے دہندوں کی جو فہرست امیدوار کے پاس تھی وہ پولنگ آفیسر کی فہرست سے بہت کچھ مختلف تھی۔ فہرستوں کی ان خرابیوں پر پورا ملک چیختا رہا لیکن اربابِ اختیار ٹس سے مس نہ ہوئے اور آخر کار انتخابات انہی غلط اور ناقص فہرستوں کی بنیاد ہی پر منعقد کرالیے گئے۔

صحیح انتخاب کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ انتخابی حلقے بالکل فطری ہوں اور ان کی تشکیل میں کسی خاص فرد یا گروہ کے مفاد کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔ لیکن حالیہ انتخابات کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہائے انتخاب کی حد بندی میں بکثرت مقامات پر آبادی کی فطری وحدت کو

نظر انداز کر کے مخصوص امیدواروں کے مصالح کو بنیادی اہمیت دی گئی اور اس معاملے میں کسی ضابطہ یا کسی اصول کی پیروی نہیں کی گئی۔ حد یہ ہے کہ بعض مقامات پر تو ایک حلقۂ انتخاب سے متصل علاقوں کو خارج کر کے دُور دراز کے علاقے اس میں شامل کیے گئے تاکہ کوئی خاص امیدوار کامیاب ہو سکے۔ مختلف حلقوں کے ووٹروں کی تعداد میں کوئی تناسب نہ تھا۔ من مانی حدبندیوں کی وجہ سے کوئی حلقہ نو سو افراد پر مشتمل تھا تو دوسرے حلقے میں ووٹروں کی تعداد ڈھائی سو نفوس سے متجاوز نہ تھی۔

انتخابات کی اصل غرض اُسی صورت میں پوری ہوتی ہے جب عوام کو مقررہ مدت کے بعد کسی دباؤ، لالچ، تحریص یا تخویف کے بغیر ٹھیک ٹھیک اپنے ضمیر کے مطابق اظہار رائے کا موقع میسر آئے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز اُسی شکل میں ممکن ہے جب لوگوں کے نزدیک ضمیر منڈی کا مال نہ بننے پاتے۔ لیکن اگر کوئی فرد یا گروہ انسانوں کو اپنے ضمیر کا سودا کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو وہ درحقیقت انسانیت کے خلاف ایک شرمناک سازش کرتا ہے۔ کسی انسان کے عزوشرف بلکہ اُس کی انسانیت کا دارومدار اُس کے ضمیر پر ہے۔ اگر اس کا ضمیر بیدار ہے تو وہ خوب و ناخوب کے درمیان تمیز کر سکتا ہے، حق کی حمایت پر کمربستہ اور باطل کے خلاف صف آرا ہو سکتا ہے، اور اس طرح اپنے ذاتی مفادات کو ملک و قوم، مذہب اور پوری انسانیت کی بھلائی کے لیے قربان کرنے کا حوصلہ رکھ سکتا ہے۔ اسی ضمیر کی بیداری سے اُس کا دین، ایمان، اور اخلاق قائم ہے اور اگر یہ مردہ ہو جائے تو اس کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ دُنیا کی ہر عقلمند قوم جہاں تعلیم و تربیت کے ذریعہ عوام کے ضمیر کو زندہ رکھنے کا سامان کرتی ہے وہاں وہ مختلف اوقات میں پوری قوم کو ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جب اس کا ضمیر آزادی کے ساتھ فیصلے کر کے قوت و توانائی حاصل کر سکے۔ انتخاب اسی قسم کے قیمتی مواقع میں سے ایک نہایت زریں موقع ہے۔ اس میں عوام کو اس امر کی تربیت ملتی ہے کہ وہ کسی خوف، لالچ یا دباؤ کے بغیر ذاتی مفادات اور مصلحتوں کو یکسر نظرانداز

کرتے ہوئے محض اپنے ضمیر کی تحریک پر کوئی فیصلہ کریں۔

مگر افسوس ہے کہ ہمارے ہاں تازہ انتخابات میں عوام کو بہت بڑے پیمانے پر ضمیر فروشی کی تربیت دی گئی۔ ہزارہا روپے خرچ کرکے لوگوں سے ووٹ خریدے گئے اور خریدے ہوئے ووٹوں سے جیتنے والوں نے نہ صرف خود فخریہ اپنی کامیابیوں کا ڈھول پیٹا بلکہ قوم کے سرپرستوں نے ان کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر ان کو خوب شاباش دی۔ دوسری طرف ووٹ بیچنے والوں نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ کھلم کھلا اپنے ایمان و ضمیر کے سودے کیے اور کسی نے یہ محسوس تک نہ کیا کہ اپنے آپ کو بکاؤ مال بنا کر وہ کس ذلت کے گڑھے میں جا گرے ہیں۔

جن حضرات نے اپنی قوم کو ضمیر فروشی کی یہ تربیت دی ہے انہیں غور کرنا چاہیے کہ بے ضمیر افراد کا جو لشکر انہوں نے تیار کیا ہے وہ آخر ملک و ملت کے کس کام آ سکتا ہے۔ انسان جب اپنے ایمان و ضمیر کا سودا کرنے پر ایک دفعہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ کس کے ہاتھ اپنی متاعِ ایمان فروخت کر رہا ہے۔ اُسے جہاں سے بھی زیادہ قیمت وصول ہوگی وہ بے تکلف اسے بیچ ڈالے گا۔ آج جو لوگ آپ کے ہاتھ اپنے ضمیر بیچنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں، آپ کے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل وہ کسی دشمن کے ہاتھ اپنا ملک بیچ دینے پر تیار نہ ہو جائیں گے؟ جس بچے کو عہدِ طفولیت میں چھوٹی چھوٹی چیزیں چرانے کی عادت پڑ جائے اور ان چوریوں پر اُلٹی اس کی ہمت افزائی کی جاتی رہے، وہ ایک روز دھاڑی چور بن کر رہتا ہے۔ اس کا ڈاکو اور رہزن بن جانا نہیں بلکہ ایماندار بن کر اٹھنا خلافِ توقع ہوگا۔

جو حضرات بنیادی جمہوریتوں کے ممبر منتخب ہونے کے لیے آگے بڑھے انہیں ملت کی تعمیرِ نو میں اساس اور بنیاد کا کام دینا ہے۔ اُن کی اصابتِ رائے پر قوم کے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ اُن کے اخلاق کی مضبوطی سے قومی اخلاق کی پختگی وابستہ ہے۔ لیکن یہ بات شدید کرب و اضطراب کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ قوم کے ان بنیادی نمائندوں کی ایک بڑی تعداد نے

جس اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کی بہو بیٹیوں کو محض انتخاب میں کامیاب ہونے کے لیے ایسے ایسے ذلیل حربے استعمال کرنے کی تربیت دی جن کے تذکرے سے غیرت سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب ہم یہ تصور تک نہ کر سکتے تھے کہ کوئی مسلمان عورت کسی غیر مرد کو اپنا شوہر کہہ سکتی ہے لیکن یہاں ہزاروں عورتوں نے دس دس غیر آدمیوں کو اپنا شوہر قرار دے کر ان کی بیوی کی حیثیت سے ووٹ ڈالے۔ کنواریوں نے بیگم فلاں بن کر ووٹ دیا۔ بیاہی ہوئی عورتوں نے اپنے شوہر کے سوا دوسروں کو اپنا شوہر بنایا۔ حد یہ ہے کہ بہنوں نے اپنے سگے بھائیوں کو اپنا شوہر قرار دینے میں بھی تامل نہ کیا۔ اور یہ کام باپوں، بھائیوں، شوہروں اور بیٹوں کی بے علمی میں نہیں بلکہ ان کی رضامندی اور ان کے اپنے ایماء سے کیا گیا، کیونکہ کسی خاص امیدوار کے جیتنے سے ان کا مفاد وابستہ تھا۔ اسی طرح ہزارہا آدمیوں نے بے تکلف دوسروں کو اپنا باپ بنایا اور اس پر نہ خود انہیں کوئی شرم آئی نہ ان کے باپوں اور ان کی ماؤں کی غیرت میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ اس ذلت کے گڑھے میں اپنی قوم کو اُن لوگوں نے جان بوجھ کر گرایا جو ہر قیمت پر انتخاب جیتنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ ہر جگہ فاحشہ عورتوں کی پوری پوری پلٹنیں پولنگ کے میدان میں اتاری گئیں جہاں انہوں نے جعلسازی میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے پورا زور صرف کیا۔

پھر بلیئیے اور غنڈے اور اسی طرح کے دوسرے سماج دشمن عناصر جو معاشرے کے لیے عذاب ہوتے ہیں اور جن کی شر انگیزیوں سے سوسائٹی کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس سرگرم عمل رہتی ہے، انہیں قوم کے سر پر لا کر سامنے لایا گیا اور ان کی سرپرستی اور پشت پناہی میں بہت سے حلقوں نے انتخاب لڑا۔ ان خدمات کے لیے ان کی نہ صرف پذیرائی ہوئی بلکہ انہیں مختلف شکلوں میں بیش بہا انعامات سے نوازا گیا۔ وہ لوگ جن کے نام پولیس کے رجسٹروں میں درج تھے انہیں اس "حسن کارکردگی" کے صلے میں معزز شہری کی اسناد عطا کی گئیں اور انہیں ایسے بلند مرتبہ

لوگوں کے ہاں باریابی نصیب ہوئی جنہیں اہلِ ملک نے بھاری بھرکم مشاہروں پر ان ناپسندیدہ عناصر کی بیخ کنی کے لیے متعین کر رکھا تھا۔ ان غنڈوں نے جو کارنامے انجام دیئے ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ انھوں نے مخالف امیدوار کو سرے سے پولنگ اسٹیشن میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ کہیں مخالف امیدوار کو یہ دھمکی دے کر مقابلے سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو اسی وقت اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ کثیر التعداد مقامات پر انہوں نے سخت کشت و خون کیا۔ بہت سے مقامات پر شریف خواتین تک ان کی بدتمیزیوں سے نہ بچ سکیں اور یہ سب کچھ انھوں نے اس بھروسے پر کیا کہ نظم و نسق کی محافظ طاقت ان سے کوئی باز پرس نہ کرے گی۔ جو لوگ آج ان سماج دشمن عناصر کی خدمات سے مستفیض ہو رہے ہیں اس وقت انہیں اپنی اس غلط روش کا احساس نہ ہو، لیکن انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وہ ملک کے اندر ایک ایسی خوفناک آگ بھڑکانے کی حماقت کر رہے ہیں جس کی شعلہ فشانیاں نہ صرف ملک کے امن و امان کو غارت کر کے رکھ دیں گی بلکہ خود انہیں اپنے جان و مال کو ان کی لپیٹ سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ غنڈے کسی کی خدمت بھی بلا معاوضہ نہیں کرتے۔ ان سے خدمت لینے والوں کو لامحالہ انہیں ہر طرح کے جرائم کی چھوٹ دینی پڑے گی، اور یہ سودا لامحالہ اس ملک کے ہر باشندے کو بہت مہنگا پڑے گا۔ اس کی گراں قیمت ادا کرنے سے خود ان غنڈوں کے پرورش کرنے والے بھی نہیں بچ سکتے۔ وہ خود نہیں تو ان کی آل اولاد کسی وقت اس کی قیمت ادا کرے گی۔ جو لوگ وقتی منفعتوں کے حصول کے لیے یا ان کے زیاں کے خوف سے اپنا دماغی توازن اس حد تک کھو بیٹھیں کہ انہیں اپنے کسی مذموم فعل کے خطرناک انجام کا ہوش نہ رہے، ان سے ملک اور اہل ملک کوئی اچھی توقعات وابستہ نہیں کر سکتے۔

آزاد انتخابات کے لیے دوسری شرائط کے علاوہ ایک ضروری اور اہم شرط یہ بھی ہے کہ اس میں حکومت کی انتظامی مشینری بالکل غیر جانبدار رہے۔ کیونکہ اس کی بالواسطہ یا بلاواسطہ

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۲	نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۴ء	عدد ۳ و ۴

سالانہ چندہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

مداخلت رائے عامہ کو صحیح طور پر نمایاں ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر جمہوریت پسند قوم اس بات کا پورا پورا اہتمام کرتی ہے کہ اُس کے سرکاری ملازم انتخابات میں کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت نہ کریں، اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ سے ملک کے عوام جن لوگوں پر بھی اعتماد کر کے اقتدار کی باگیں سونپیں یہ ملازمین پورے خلوص اور جذبۂ تعاون کے ساتھ ان کے ماتحت کام کریں۔ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے ان کو اس امر سے کوئی بحث نہ ہونی چاہیے کہ عوام ملک کا اقتدار کسے سونپیں اور کسے نہ سونپیں۔ یہ بات عملی طور پر ناممکن ہے کہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والا ہر گروہ عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی سول اور فوجی ملازمین کی نئی بھرتی شروع کر دے۔ اس لیے جمہوری حکومت کا معروف قاعدہ یہ ہے کہ ملازمین کو سیاسی دھڑے بندیوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے اور انہیں کسی مقام پر بھی ان میں ملوث نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ اگر آج ایک گروہ ان کی قوت و طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے مخالفین کو نیچا دکھاتا ہے تو کل دوسرا گروہ بھی ان کی مدد سے اپنے مدِمقابل کو کچلنے سے دریغ نہ کرے گا۔ جب ملازمین سے اس طرح کی ناجائز خدمات لی جائیں گی تو وہ بھی اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے ایک پارٹی کی حیثیت سے سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں گے اور بساطِ سیاست پر مختلف مُہروں کو اپنی منشا اور مرضی کے مطابق چلانے لگیں گے۔ یہ صورتِ حال حکومت کے انتظام و انصرام کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے اور اس سے ساری انتظامی مشینری بیکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

دُنیا کے جمہوری ممالک میں اس روایت کا حکومت کے سربراہوں اور ملازموں دونوں کی طرف سے جس طرح احترام کیا جاتا ہے اس کا اندازہ امریکہ کے حالیہ انتخابات کے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ صدر جانسن انتخابات سے پہلے اس امر کے لیے بے حد کوشاں تھے کہ وہ اپنے معاشی منصوبوں کے بارے میں ماہرینِ معاشیات کی رائے معلوم کریں۔ یہ ذہن نشین

رہے کہ یہ مشیر صدر جانسن کے لیے کوئی اجنبی نہ تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو ان کے ساتھ حکومت کے عہدہ دار کی حیثیت سے کئی برس سے شریکِ کار رہے۔ ایک دن ان سب کو جانسن نے اپنے ایک رفیقِ کار کی وساطت سے ایک پارٹی میں مدعو کیا۔ وہاں حکومت کی کارگزاریوں پر قریب قریب ایک گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی اور ان ماہرینِ معیشت نے ان کے بعض پہلوؤں کو محتاط الفاظ میں سراہا۔ صدر جانسن نے جب یہ محسوس کیا کہ ان معیشت دانوں کی دیانتدارانہ رائے ان کے حق میں ہے تو ان کے دل میں بالکل فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس رائے کی نشر و اشاعت کا کوئی انتظام کریں۔ چنانچہ اخباری نمائندوں کو فوراً اطلاع کی گئی اور وہ معیشت دانوں کے گرد استفسار کی غرض سے جمع ہو گئے۔ ان حضرات کو صدر جانسن کی اس حرکت سے سخت کوفت ہوئی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ انہیں صدر اپنی انتخابی مہم میں بطور آلۂ کار استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ بے حد برہم ہوئے اور انھوں نے اخباری نمائندوں کے سامنے حکومت کے معاشی منصوبوں کی تعریف کرنے کی بجائے اس کے کمزور پہلوؤں کو اُبھارنا شروع کر دیا۔ صدر جانسن نے جس مقصد کے تحت یہ ساری کارروائی کی تھی اُس میں انہیں سخت ناکامی ہوئی اور انہیں بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان اٹھانا پڑا۔ (ٹائم، امریکہ ۲۸ راگست ۱۹۶۴ء)

جناب محمد ایوب خاں صاحب خود بھی اصولی اعتبار سے ملازمینِ حکومت کے سیاست سے الگ تھلگ رہنے کے قائل ہیں۔ یہاں ہم ان کی ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کی نشری تقریر کے وہ الفاظ نقل کرتے ہیں جو انھوں نے فوجی افسروں اور سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہے تھے:

"سیاست سے الگ رہو ... تم کو پارٹیوں کی سیاست میں عملی حصہ لینے اور کسی نقطۂ نظر کو پھیلانے سے قطعی پرہیز کرنا چاہیے ... ہم پاکستان کے ملازم ہیں اور اسی حیثیت سے ہم اس پارٹی کے ملازم ہیں جس کو لوگ برسرِ اقتدار لائیں"۔

کتنا صحیح ہے یہ نظریہ اور کتنا صائب ہے یہ مشورہ! لیکن ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نظریہ کے پُر جوش مبلغین کے ہاتھوں عمل کی دنیا میں اس کی جس قدر تذلیل ہوئی ہے وہ جمہوریت کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ سب سے پہلے پولیس کے ذریعہ امیدواروں کے رجحانات کا کھوج لگایا گیا اور جب اس امر کا پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ انتخاب میں حصہ لینے والا ایک گروہ برسرِ اقتدار طبقہ کا دل و جان سے خیر خواہ اور وفادار ہے تو پھر اُسے کامیاب بنانے کے لیے کھلے بندوں ہر قسم کی جعلسازیاں کی گئیں۔ ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ اِن میں سے جو ذرا با اثر تھے انہیں مختلف قسم کی رشوتیں دی گئیں۔ اور اگر انہیں رام نہ کیا جا سکا تو پھر اُن پر مختلف قسم کے مقدمات بنا دیئے گئے۔

اس کے بعد پولنگ کے موقع پر سرکاری ملازمین کے سامنے جس قسم کی دھاندلیاں کی گئیں اور انہوں نے محض برسرِ اقتدار طبقہ کی خوشنودی کی خاطر ان سے جس طرح اغماض برتا اُس نے عوام کے اعتماد کو شدید صدمہ پہنچایا ہے۔ جعلی ووٹ علانیہ بھگتائے گئے اور اصلی ووٹروں کی قطاریں بے بسی کے ساتھ کھڑی دیکھتی رہیں کہ ان کے نام سے کرائے کے آدمی ووٹ ڈال رہے ہیں۔ اِس بُرائی کے خلاف ہر احتجاج بے کار گیا اور کسی نے اسے نہ روکا۔ پولنگ اسٹیشنوں پر علانیہ غنڈہ گردی ہوئی اور پولیس تماشائی بنی دیکھتی رہی۔ پریزائڈنگ افسروں نے بعض جگہ خود جعلی ووٹوں کی پرچیاں بکسوں میں ڈالیں۔ جہاں سرکاری افسروں نے انتخابات میں غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی وہاں فوری طور پر ان کے تبادلے کئے گئے اور دوسرا عملہ مقرر کر دیا گیا تاکہ برسرِ اقتدار پارٹی کو دھاندلیاں کرنے میں سہولت ہو۔ امیدواروں اور ان کے ایجنٹوں کو دھکے مار مار کر پولنگ اسٹیشنوں سے نکال دیا گیا اور بعض جگہ انہیں سرے سے اندر گھسنے ہی نہیں دیا گیا۔ جعلی ووٹروں کو پکڑ کر حکام کے حوالہ کیا گیا مگر وہ چھوڑ دیئے گئے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بےشمار واقعات کسی گہری تلاش اور جستجو کے بعد منظرِ عام پر نہیں لائے گئے بلکہ یہ وہ عام واقعات ہیں جن سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں اور جنہیں ہر دیکھنے والی آنکھ نے خود

مشاہدہ کیا ہے۔ آخر ہمارے ملک میں کونسا ایسا شخص ہے جس کے سامنے غنڈوں کی چیرہ دستیاں اور پولیس کا تغافل نہ آیا ہو۔ ملک کی عظیم اکثریت اس افسوسناک حقیقت پر شاہد ہے کہ سماج دشمن عناصر بے بس ووٹروں کو ڈراتے دھمکاتے اور مارتے پیٹتے رہے لیکن پولیس، جو مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر امن قائم کرنے کے لیے متعین کی گئی تھی، بے بسوں کی کوئی دستگیری کرنے سے قاصر رہی۔ شرپسند عناصر من مانی کارروائیاں کر رہے تھے اور امن کے محافظوں نے غیر متعلق تماشائی بنا کر ان المناک مناظر کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔ سوائے ان مقامات کے جہاں پوری آبادی متحد ہو کر کسی شریف آدمی کو کامیاب کرانے میں دلچسپی لے رہی تھی، باقی حلقوں میں شیطنت کو حکمرانی کے لیے بالکل کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی۔ پولیس اگر کہیں حرکت میں آئی بھی تو وہ دھاندلی وخرابی کو روکنے کے لیے نہیں بلکہ ان خرابیوں کے سدباب کی کوششوں کو غیر مؤثر اور ناکام بنانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوتی۔ چنانچہ پولیس اور انتظامیہ کے اس افسوسناک تغافل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان انتخابات میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔

جان و مال، عزت و آبرو کا یہ زیاں بڑا المناک ہے اور اس کے اثرات سے ملک کی پوری اجتماعی زندگی کا متاثر ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ جب انتظامیہ کی زیرِ نگرانی دھاندلی اور جعلسازی کی جائے تو عوام کا جمہوریت پر اعتماد بالکل متزلزل ہو جاتا ہے۔ شریف اور نیک نفس شہری انتخاب سے پناہ مانگتے ہیں اور اس بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ یہ کام خدا ترس اور باضمیر لوگوں کو زیب نہیں دیتا بلکہ یہ غنڈوں یا غنڈوں کی سرپرستی کرنے والوں ہی کے لیے موزوں ہے۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ اگر کسی ملک میں شرفا عوام کی نمائندگی سے دستکش ہونے لگیں اور ان کے اجتناب اور عدمِ دلچسپی کی وجہ سے یہ ذمہ داری ملک کے اخلاق باختہ اور بے ضمیر لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو وہ ملک بربادی کے کسی خطرناک طوفان سے کیوں دوچار نہ ہو گا؟

انتخابات کے بارے میں یہ احساس لوگوں کو جمہوریت سے سخت مایوس بلکہ متنفر اور بدظن کر دیتا ہے اور اُن کے دل و دماغ میں آہستہ آہستہ یہ خیال راسخ ہونے لگتا ہے کہ یہاں جائز آئینی راستوں سے اقتدار میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی - یہ رجحان بڑا خطرناک ہے اور ہر ہوشمند اور امن پسند شہری کو اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ یہ احساس کبھی کسی معقول اور صحت مند تحریک کی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ آتش فشاں پہاڑ بن کر پھٹتا ہے جس سے صرف ایک ملک کا امن ہی غارت نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت کو شدید اخلاقی جھٹکے لگتے ہیں -

---

فی الحقیقت صدرِ مملکت محمد ایوب خاں صاحب کے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت ہے - یہ اُن کے اخلاص اور عزم کی آزمائش ہے - یہ اُن کے فہم و تدبر کی آزمائش ہے - آج اگر قوم کسی دباؤ کے بغیر اپنی آزاد مرضی سے عنانِ اقتدار اُن کے ہاتھ میں سونپ دے تو چشم ما روشن دل ما شاد - وہ بڑی خوشی کے ساتھ قوم کے اس اعتماد کو قبول فرمائیں لیکن اگر عوام ان کے بجائے کسی دوسری شخصیت پر اپنے اعتماد کا اظہار کریں تو اُن کے لیے معقول اور صحیح راستہ یہی ہے کہ وہ عوام کے فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں - ان کے اس اقدام سے ملک کے اندر جمہوریت کو تقویت حاصل ہوگی اور جمہوری روایات کے نشو و نما کے لیے ایک صحت مند فضا پیدا ہوگی -

ملک و ملت کی خدمت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص لازمی طور پر برسرِ اقتدار ہی ہو - یہ خدمت حزبِ اختلاف کے اندر رہ کر بھی سرانجام دی جا سکتی ہے - صدر صاحب کے دورِ اقتدار کے کارنامے پورے ملک کے سامنے ہیں - اگر عوام ان سے مطمئن نہ ہوں اور ان کے خلاف فیصلہ کر دیں تو ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خونی انقلاب کے خدشات بیان کرنے کے بجائے ایک مؤثر حزبِ اختلاف کی تشکیل کریں اور ان سارے فرائض کو ایمانداری

جرأت اور اخلاص کے ساتھ سر انجام دیں جو کسی جمہوری ملک میں حزبِ اختلاف پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ اُن کی ایک عظیم خدمت ہو گی جس سے آنے والی نسلیں رہنمائی حاصل کریں گی۔

ملک کی انتظامیہ، عدلیہ اور رائے عامہ اگر مضبوط ہوں تو حکومت کی تبدیلی سے نہ تو ملک کا وقار کم ہوتا ہے اور نہ اس کی قوت وطاقت میں کسی لحاظ سے کوئی کمی آتی ہے۔ فرانس سے زیادہ کس ملک میں حکومت کرنے والے ہاتھ مسلسل اور سرعت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ لیکن ان پیہم تبدیلیوں سے فرانس کو کسی طرح کا کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہاں کے سول اور فوجی ملازمین نے رائے عامہ کا ہمیشہ احترام کیا اور جس گروہ کو بھی عوام نے قومی مفاد کے پیش نظر اقتدار کی باگیں سونپیں۔ ملازمینِ حکومت نے پورے جذبۂ اخلاص کے ساتھ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی اور جو فرائض ان کے سپرد کیے گئے انہیں پوری نیک نیتی کے ساتھ سر انجام دیا۔

اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم ملک کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے کچھ نظریات رکھتا ہو تو وہ استعفا دے کر سیاست کے میدان میں آئے۔ اُسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قوت کے بل بوتے پر اپنے نظریات لوگوں پر مسلط کرے۔ اس کے لیے صحیح اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ ملازمت سے الگ ہو کر اپنے دلپسند افکار و نظریات کا عوام میں پرچار کرے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے جمہوری طریق سے اقتدار کے تخت پر متمکن ہو۔ پھر عوام کے معتمد نمائندے کی حیثیت سے اپنے ارادوں کی تکمیل کرنا اس کا حق ہے۔ لیکن یہ چیز تو ابتدائی ضابطۂ اخلاق کے بھی منافی ہے کہ کسی سرکاری ملازم کو جو اختیارات ملک کے انتظام و انصرام کے لیے تفویض کیے گئے ہیں انہیں وہ اپنے دلپسند نظریات کے تسلط کے لیے استعمال کرنا شروع کر دے۔

اس کا یہ فعل دستور، آئین، عقل اور اخلاق کسی نقطۂ نظر سے بھی صحیح اور درست نہیں ہو سکتا۔

"خونی انقلاب" کی بات سامنے آگئی ہے تو اس سلسلے میں بھی ہم صدرِ مملکت کی خدمت میں پورے خلوص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں کہ اس وقت جبکہ مسندِ اقتدار کے بارے میں فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہے، اُن کا یہ ارشاد کہ "اگر عوام کے فیصلے کے نتیجے میں اقتدار اپوزیشن کی طرف منتقل ہو گیا تو ملک میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہو جائے گا جو جو اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی طرح نرم اور پُرامن نہ ہوگا" کسی اعتبار سے بھی اُن کے شایانِ شان نہیں۔ انھوں نے بلاشبہ اس امر کا یقین دلایا ہے کہ اس متوقع انقلاب کے لانے والے وہ خود نہ ہوں گے لیکن اُن کا یہ ارشاد اس مرحلہ پر بڑا معنی خیز ہے اور اسے دھمکی کے سوا اور کسی مفہوم میں نہیں لیا جا سکتا۔ اس سے اُن کی برہمی اور رنجیدگی کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ عوامی فیصلے کو قبول تو کر لیں گے لیکن خوش دلی کے ساتھ نہیں بلکہ تردّد اور ناراضگی کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے دل میں رائے عامہ کی وہ قدر و منزلت نہیں جو ایک جمہوریت پسند قائد کے دل میں ہونی چاہیے۔

صدرِ محترم کے اس بیان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی نے جو تبصرہ فرمایا ہے اس کے ایک حصے کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں:

"صدر محترم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اپوزیشن کے لوگ سیاسی لیڈروں کے اس انجام سے سبق لیں جو دوسرے ملکوں میں فوجی انقلابات کے بعد ہوا ہے۔ میں اُن کے اس ارشاد کی تائید کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس کے ساتھ فوجی انقلاب کرنے والے بھی اس انجام سے سبق سیکھیں جو جنوبی امریکہ، جنوبی ویت نام، عراق، شام وغیرہ ممالک کے انقلابی ڈکٹیٹروں نے دیکھا ہے، اور جس سے ابھی چند روز پہلے سوڈان کے جنرل عبود صاحب کو سابقہ پیش آیا ہے۔ صدر صاحب نے ملک

(باقی ص ۱۴۴ پر)

تفہیم القرآن

حٰمٓ السجدہ

(۲)

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

حٰمٓ، یہ خدائے رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔[1]

---

[1] یہ اس سورہ کی مختصر تمہید ہے۔ آگے کی تقریر پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس تمہید میں جو باتیں ارشاد ہوئی ہیں وہ بعد کے مضمون سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ بکواس کرتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ مزید براں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اگر اس کلام کو سن کر چیں بجبیں ہوتے ہو تو تمہارا یہ غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رد کرتے ہو اور اگر اس سے بے رخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان (رحمان اور رحیم) ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے صفتِ رحمت کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس نے اپنی رحیمی کے اقتضا سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اس سے

مخاطبین کو خبردار کیا گیا ہے کہ اِس کلام سے اگر کوئی بے رخی برتتا ہے، یا اسے رد کرتا ہے، یا اس پر چیں بجبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمت عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسانوں سے بے رخی برتتا تو انہیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اِس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ یعنی اس میں کوئی بات گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر دے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور بُرے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اس کا اپنا خسارہ ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رد کرتا ہے یا اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اُس کے اس رویّے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود برسرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہلِ عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں خدا نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانا وہ نہیں بنا سکتے۔ (اس مقام پر آیت ۴۴ بھی پیشِ نظر رہے جس میں یہی مضمون ایک دوسرے طریقے سے بیان ہوا ہے۔ اور یہ شبہ کہ پھر غیر اہلِ عرب کے لیے تو قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنے کے لیے ایک معقول عذر موجود ہے، اس سے پہلے ہم رفع کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۳۸۳، ۳۸۴۔ رسائل و مسائل حصہ اول، ص ۱۹ تا ۲۳)

مگر اِن لوگوں میں سے اکثر نے اس سے رُوگردانی کی اور وہ سُن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں[۵] ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے[۶]۔ تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے[۷]"۔

اَے نبی، اِن سے کہو، مَیں تو ایک بشر ہوں تم جیسا[۸]۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے[۹]، لہٰذا تم سیدھے اُسی کا رُخ اختیار کرو[۱۰] اور اس سے

پانچویں بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اُسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرا دینے والی ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیل، ایک فلسفہ، اور ایک نمونۂ انشا پیش کرتی ہو جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو۔ بلکہ یہ ہانکے پکارے تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شاندار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔

[۵] یعنی اُس کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔

[۶] یعنی اِس دعوت نے ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ اس نے ہمیں اور تمہیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا ہے۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ بن گئی ہے جو ہم کو اور تم کو جمع نہیں ہونے دیتی۔

[۷] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کو تم سے اور تم کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ دوسرے یہ کہ تم اپنی دعوت سے باز نہیں آتے تو اپنا کام کیے جاؤ، ہم بھی تمہاری مخالفت سے باز نہ آئیں گے اور جو کچھ تمہیں نیچا دکھانے کے لیے ہم سے ہو سکے گا کریں گے۔

[۸] یعنی میرے بس میں یہ نہیں ہے کہ تمہارے دلوں پر چڑھے ہوئے غلاف اتار دوں، تمہارے

معافی چاہو۔ تباہی ہے اُن مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے[۹] اور آخرت کے منکر ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے[۱۰]۔ ع ۱

بہرے کان کھول دوں، اور اُس حجاب کو پھاڑ دوں جو تم نے خود ہی میرے اور اپنے درمیان ڈال لیا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں۔ اُسی کو سمجھا سکتا ہوں جو سمجھنے کے لیے تیار ہو، اُسی کو سُنا سکتا ہوں جو سننے کے لیے تیار ہو، اور اُسی سے مل سکتا ہوں جو ملنے کے لیے تیار ہو۔

[۶] یعنی تم چاہے اپنے دلوں پر غلاف چڑھا لو اور اپنے کان بہرے کر لو، مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارے بہت سے خدا نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی خدا ہے جس کے تم بندے ہو۔ اور یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے جو میں نے اپنے غور و فکر سے بنایا ہو، جس کے صحیح اور غلط ہونے کا یکساں احتمال ہو، بلکہ یہ حقیقت مجھ پر وحی کے ذریعہ سے منکشف کی گئی ہے جس میں غلطی کے احتمال کا شائبہ تک نہیں ہے۔

[۷] یعنی کسی اور کو خدا نہ بناؤ، کسی اور کی بندگی و پرستش نہ کرو، کسی اور کو مدد کے لیے نہ پکارو، کسی اور کے آگے سرِ تسلیم و اطاعت خم نہ کرو، کسی اور کے رسم و رواج اور قانون و ضابطہ کو شریعتِ واجب الاطاعت نہ مانو۔

[۸] معافی اُس بے وفائی کی جو اب تک تم اپنے خدا سے کرتے رہے، اُس شرک اور کفر اور نافرمانی کی جس کا ارتکاب تم سے اب تک ہوتا رہا، اور اُن گناہوں کی جو خدا فراموشی کے باعث تم سے سرزد ہوتے۔

[۹] یہاں زکوٰۃ کے معنی میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن عباس اور ان کے جلیل القدر شاگرد عکرمہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس مقام پر زکوٰۃ سے مراد وہ پاکیزگیٔ نفس ہے جو توحید کے عقیدے اور اللہ کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تباہی ہے اُن مشرکین کے لیے جو پاکیزگی اختیار نہیں کرتے۔ دوسرا گروہ جس میں قتادہ، سُدِّی، حسن بصری، ضحاک، مُقاتِل اور ابن السائب جیسے مفسرین شامل ہیں۔ اس لفظ کو یہاں بھی زکوٰۃِ مال ہی کے معنی میں لیتا ہے

اُسے نبی، ان سے کہو، کیا تم اُس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اُس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں[11] اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا[12]

اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو شرک کر کے خدا کا اور زکوٰۃ نہ دے کر بندوں کا حق مارتے ہیں۔

۱۰؎ اصل میں اجر غیر ممنون کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے دو معنی اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایسا اجر ہوگا جس میں کبھی کمی نہ آئے گی۔ دوسرے یہ کہ وہ اجر احسان جتا جتا کر نہیں دیا جائے گا جیسے کسی بخیل کا عطیہ ہوتا ہے کہ اگر وہ جی کڑا کر کے کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو بار بار اس کو جتاتا ہے۔

۱۱؎ زمین کی برکتوں سے مراد وہ بے حد و حساب سروسامان ہے جو کروڑہا کروڑ سال سے مسلسل اُس کے پیٹ سے نکلتا چلا آ رہا ہے اور خوردبینی کیڑوں سے لے کر انسان کے بلند ترین تمدن تک کی روز افزوں ضروریات پوری کیے چلا جا رہا ہے۔ ان برکتوں میں سب سے بڑی برکتیں ہوا اور پانی ہیں جن کی بدولت ہی زمین پر نباتی، حیوانی اور پھر انسانی زندگی ممکن ہوئی۔

۱۲؎ اصل الفاظ ہیں: قَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ۔ اس فقرے کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ بعض مفسرین اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے ٹھیک حساب سے رکھ دیے پورے چار دنوں میں" یعنی کم یا زیادہ نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں۔ ابن عباس، قتادہ اور سُدی اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق چار دنوں میں رکھ دیئے، پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا" یعنی جو کوئی یہ پوچھے کہ یہ کام کتنے دنوں میں ہوا، اُس کا مکمل جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں ہو گیا۔ ابن زید اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ "زمین میں اس کے ارزاق مانگنے والوں کے لیے چار دنوں کے اندر رکھ دیئے ٹھیک انداز سے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق"۔

جہاں تک قواعدِ زبان کا تعلق ہے، آیت کے الفاظ میں یہ تینوں معنی لینے کی گنجائش ہے، لیکن ہمارے نزدیک پہلے دو معنوں میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیا اہمیت رکھتی ہے کہ یہ کام ایک گھنٹہ کم چار دن یا ایک گھنٹہ زیادہ چار دن میں نہیں بلکہ پورے چار دنوں میں ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت اور کمالِ ربوبیت اور کمالِ حکمت کے بیان میں کون سی کسر رہ جاتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے اس تصریح کی حاجت ہو؟ اسی طرح یہ تفسیر بھی بڑی کمزور تفسیر ہے کہ "پوچھنے والوں کا جواب پورا ہُوا"۔ آیت سے پہلے اور بعد کے مضمون میں کسی جگہ بھی کوئی قرینہ یہ نہیں بتاتا کہ اُس وقت کسی سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ یہ سارے کام کتنے دنوں میں ہوئے، اور یہ آیت اس کے جواب میں نازل ہوئی۔ اِنہی وجوہ سے ہم نے ترجمے میں تیسرے معنی کو اختیار کیا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زمین میں ابتدائے آفرینش سے لیکر قیامت تک جس جس قسم کی جتنی مخلوق بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا تھا، ہر ایک کی مانگ اور حاجت کے ٹھیک مطابق غذا کا پورا سامان حساب لگا کر اُس نے زمین کے اندر رکھ دیا۔ نباتات کی بے شمار اقسام خشکی اور تری میں پائی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی غذائی ضروریات دوسری اقسام سے مختلف ہیں۔ جاندار مخلوقات کی بے شمار انواع ہوا اور خشکی اور تری میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور ہر نوع ایک الگ قسم کی غذا مانگتی ہے۔ پھر ان سب سے جُدا، ایک اور مخلوق انسان ہے جس کو محض جسم کی پرورش ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے بھی طرح طرح کی خوراکیں درکار ہیں۔ اللہ کے سوا کون جان سکتا تھا کہ اس کرۂ خاکی پر زندگی کا آغاز ہونے سے لے کر اُس کے اختتام تک کس کس قسم کی مخلوقات کے کتنے افراد کہاں کہاں اور کب کب وجود میں آئیں گے اور اُن کو پالنے کے لیے کیسی اور کتنی غذا درکار ہوگی۔ اپنی تخلیقی اسکیم میں جس طرح اُس نے غذا طلب کرنے والی اِن مخلوقات کو پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اُسی طرح اُس نے اُن کی طلب کو پُورا کرنے کے لیے خوراک کا بھی مکمل انتظام کر دیا۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصورِ اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے نام سے نکالا ہے وہ سوائً للسائلین کا ترجمہ "سب مانگنے والوں کے لیے برابر" کرتے ہیں، اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اُٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لیے برابر خوراک رکھی ہے، لہٰذا آیت کے

یہ سب کام چار دن میں ہوگئے۔[۱۳] پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہُوا جو اس وقت محض دھواں تھا۔[۱۴] اُس

منشا کو پورا کرنے کے لیے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے، کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی جس کا یہ "قرآنی قانون" تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، صرف انسان ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا واقعی ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے؟ کیا فطرت کے اس پورے نظام میں کہیں آپ کو غذا کے مساوی راشن کی تقسیم کا انتظام نظر آتا ہے؟ اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نباتات اور حیوانات کی دنیا میں، جہاں انسانی ریاست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ریاست براہِ راست تقسیمِ رزق کا انتظام کر رہی ہے، اللہ میاں خود اپنے اس "قرآنی قانون" کی خلاف ورزی — بلکہ معاذاللہ، بے انصافی — فرما رہے ہیں! پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ "سائلین" میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنہیں انسان پالتا ہے، مثلاً بھیڑ بکری، گائے بھینس، گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے، اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لیے نظامِ ربوبیت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے تو کیا وہ ریاست انسان اور ان حیوانات کے درمیان بھی معاشی مساوات قائم کرے گی؟

[۱۳] اس مقام کی تفسیر میں مفسرین کو بالعموم یہ زحمت پیش آئی ہے کہ اگر زمین کی تخلیق کے دو دن، اور اس میں پہاڑ جمانے اور برکتیں رکھنے اور سامان خوراک پیدا کرنے کے چار دن تسلیم کیے جائیں، تو آگے آسمانوں کی پیدائش دو دنوں میں ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مزید دو دن ملا کر آٹھ دن بن جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر قرآن مجید میں تصریح فرمائی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق جملہ چھ دنوں میں ہوئی ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۳۶ - ۲۶۱ - ۳۲۴ - جلد دوم، ص ۴۶۰)۔ اسی بنا پر قریب قریب تمام مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ چار دن زمین کی تخلیق کے دو دن سمیت ہیں، یعنی دو دن تخلیقِ زمین کے اور دو دن زمین کے اندر اُن باقی چیزوں کی پیدائش کے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس طرح جملہ چار دنوں میں زمین اپنے سر و سامان سمیت مکمل ہوگئی لیکن

یہ بات قرآن مجید کے ظاہر الفاظ کے بھی خلاف ہے، اور درحقیقت وہ زحمت بھی محض خیالی زحمت ہے جس سے بچنے کے لیے اس تاویل کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ زمین کی تخلیق کے دو دن دراصل اُن دو دنوں سے الگ نہیں ہیں جن میں بحیثیت مجموعی پوری کائنات بنی ہے۔ آگے کی آیات پر غور کیجیے ان میں زمین اور آسمان دونوں کی تخلیق کا یکجا ذکر کیا گیا ہے اور پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دو دنوں میں سات آسمان بنا دیئے۔ ان سات آسمانوں سے پوری کائنات مراد ہے جس کا ایک جزء ہماری یہ زمین بھی ہے۔ پھر جب کائنات کے دوسرے بے شمار تاروں اور سیاروں کی طرح یہ زمین بھی اُن دو دنوں کے اندر مجرد ایک کُرے کی شکل اختیار کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ذی حیات مخلوقات کے لیے تیار کرنا شروع کیا اور چار دنوں کے اندر اس میں وہ سب کچھ سروسامان پیدا کر دیا جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے تاروں اور سیاروں میں اِن چار دنوں کے اندر کیا کچھ ترقیاتی کام کیے گئے ان کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے، کیونکہ نزولِ قرآن کے دور کا انسان تو درکنار، اِس زمانے کا آدمی بھی ان معلومات کو ہضم کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

۱۴؎ اِس مقام پر تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اوّل یہ کہ آسمان سے مراد یہاں پوری کائنات ہے، جیسا کہ بعد کے فقروں سے ظاہر ہے۔ دوسرے الفاظ میں آسمان کی طرف متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیقِ کائنات کی طرف متوجہ ہوا۔

دوم یہ کہ دھوئیں سے مراد مادّے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزاء غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ کے سائنس داں اسی چیز کو سحابیے (NEBULA) سے تعبیر کرتے ہیں اور آغازِ کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے، اِسی دخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا۔

سوم یہ کہ "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا" سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ پہلے اس نے زمین بنائی، پھر اس میں پہاڑ جمائے، برکتیں رکھنے اور سامانِ خوراک فراہم کرنے کا کام انجام دیا، پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کائنات کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا۔ اِس غلط فہمی کو بعد کا یہ فقرہ رفع کر دیتا ہے کہ اُس نے آسمان

نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔" دونوں نے کہا "ہم آگئے فرمانبرداروں

اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ اور انہوں نے کہا ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت اور بعد کی آیات میں ذکر اُس وقت کا ہو رہا ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان تھا بلکہ تخلیقِ کائنات کی ابتدا کی جا رہی تھی۔ محض لفظ ثُمَّ (پھر) کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ زمین کی پیدائش آسمان سے پہلے ہو چکی تھی۔ قرآن مجید میں اس امر کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ثُمَّ کا لفظ لازماً ترتیبِ زمانی ہی کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ ترتیبِ بیان کے طور پر بھی اسے استعمال کیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۱۲)۔

قدیم زمانے کے مفسرین میں یہ بحث مدتہائے دراز تک چلتی رہی ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ ایک گروہ اس آیت اور سورۂ بقرہ کی آیت ۲۹ سے یہ استدلال کرتا ہے کہ زمین پہلے بنی ہے۔ دوسرا گروہ سورۂ نازعات کی آیات ۲۷ تا ۳۳ سے دلیل لاتا ہے کہ آسمان پہلے بنا ہے، کیونکہ وہاں اس امر کی تصریح ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی جگہ بھی تخلیقِ کائنات کا ذکر طبیعیات یا ہیئت کے علوم سکھانے کے لیے نہیں کیا گیا ہے بلکہ توحیدُ آخرت کے عقائد پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے بے شمار دوسرے آثار کی طرح زمین و آسمان کی پیدائش کو بھی غور و فکر کے لیے پیش فرمایا گیا ہے۔ اس غرض کے لیے یہ بات سرے سے غیر ضروری تھی کہ تخلیقِ آسمان و زمین کی زمانی ترتیب بیان کی جاتی اور بتایا جاتا کہ زمین پہلے بنی ہے یا آسمان۔ دونوں میں سے خواہ یہ پہلے بنی ہو یا وہ، بہرحال دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد ہونے پر گواہ ہیں اور اس امر پر شاہد ہیں کہ ان کے پیدا کرنے والے نے یہ سارا کارخانہ کسی کھلنڈرے کے کھلونے کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اسی لیے قرآن کسی جگہ زمین کی پیدائش کا ذکر پہلے کرتا ہے اور کسی جگہ آسمان کی پیدائش کا۔ جہاں انسان کو خدا کی نعمتوں کا احساس دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ زمین کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان سے قریب تر ہے۔ اور جہاں خدا کی عظمت اور اس کے کمالِ قدرت کا تصور دلانا مقصود ہوتا ہے وہاں بالعموم وہ آسمانوں کا ذکر پہلے کرتا ہے، کیونکہ چرخِ گردوں کا منظر ہمیشہ سے انسان کے دل پر

کی طرح۔[15] تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے، اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب ہیبت طاری کرتا رہا ہے۔

۱۵ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے طریقِ تخلیق کی کیفیت ایسے انداز سے بیان فرمائی ہے جس سے خدائی تخلیق اور انسانی صناعی کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انسان جب کوئی چیز بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ اپنے ذہن میں جماتا ہے، پھر اُس کے لیے مطلوبہ مواد جمع کرتا ہے، پھر اس مواد کو اپنے نقشے کے مطابق صورت دینے کے لیے پیہم محنت اور کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں وہ مواد، جسے وہ اپنے ذہنی نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے، مسلسل اس کی مزاحمت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کبھی مواد کی مزاحمت کامیاب ہو جاتی ہے اور چیز مطلوبہ نقشے کے مطابق ٹھیک نہیں بنتی اور کبھی آدمی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ اسے اپنی مطلوبہ شکل دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک درزی قمیص بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ قمیص کی صورت کا تصور اپنے ذہن میں حاضر کرتا ہے، پھر کپڑا فراہم کر کے اُسے اپنے تصورِ قمیص کے مطابق تراشنے اور سینے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کوشش کے دوران میں اسے کپڑے کی اس مزاحمت کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ درزی کے تصور پر ڈھلنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتا، حتیٰ کہ کبھی کپڑے کی مزاحمت غالب آجاتی ہے اور قمیص ٹھیک نہیں بنتا اور کبھی درزی کی کوشش غالب آجاتی ہے اور وہ کپڑے کو ٹھیک اپنے تصور کے مطابق شکل دے دیتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا طرزِ تخلیق دیکھیے۔ کائنات کا مادہ دھوئیں کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اللہ نے چاہا کہ اسے وہ شکل دے جو اب کائنات کی ہے۔ اس غرض کے لیے اُسے کسی انسان کاریگر کی طرح بیٹھ کر زمین اور چاند اور سورج اور دوسرے تارے اور سیارے گھڑنے نہیں پڑتے، بلکہ اس نے کائنات کے اس نقشے کو جو اس کے ذہن میں تھا بس یہ حکم دے دیا کہ وہ وجود میں آجائے۔ یعنی دھوئیں کی طرح پھیلا ہوا مواد اُن کہکشانوں اور تاروں اور سیاروں کی شکل میں ڈھل جائے جنہیں وہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس مواد میں یہ طاقت

محفوظ کر دیا[۱۶]۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں[۱۷] تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول اُن کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے[۱۸] اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا "ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا، لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے

نہ تھی کہ وہ اللہ کے حکم کی مزاحمت کرتا۔ اللہ کو اسے کائنات کی صورت میں ڈھالنے کے لیے کوئی محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑی۔ اُدھر حکم ہوا، اور اِدھر وہ مواد سکڑ اور سمٹ کر فرمانبرداروں کی طرح اپنے مالک کے نقشے پر ڈھلتا چلا گیا، یہاں تک کہ ۴۸ گھنٹوں میں زمین سمیت ساری کائنات بن کر تیار ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ کے طریقِ تخلیق کی اسی کیفیت کو قرآن مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۰۵-۲۵۲-۲۵۹-جلد دوم، ص ۵۴۱-۵۴۲-جلد سوم، ص ۶۷-جلد چہارم، یٰسٓ، آیت ۸۲-المومن، آیت ۶۸)۔

[۱۶] اِن آیات کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن کے حسب ذیل مقامات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ جلد اول ص ۶۱-جلد دوم، ص ۴۴۲-۴۴۳-۵۰۰ تا ۵۰۲-جلد سوم، ص ۱۵۵ تا ۱۵۷-۲۴۸-۲۷۰-جلد چہارم یٰس، حاشیہ نمبر ۳۷-الصافات، حواشی نمبر ۵-۶)

[۱۷] یعنی اس بات کو نہیں مانتے کہ خدا اور معبود بس وہی ایک ہے جس نے یہ زمین اور ساری کائنات بنائی ہے، اور اپنی اس جہالت پر اصرار ہی کیے چلے جاتے ہیں کہ اُس خدا کے ساتھ دوسروں کو بھی، جو حقیقت میں اس کے مخلوق و مملوک ہیں، معبود بنائیں گے اور اس کی ذات و صفات اور حقوق واختیارات میں انہیں اُس کا شریک ٹھیرائیں گے۔

[۱۸] اس فقرے کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے پاس رسول کے بعد رسول آتے رہے۔ دوسرے یہ کہ رسولوں نے ہر پہلو سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور ان کو راہ راست پر لانے

تم بھیجے گئے ہو۔[۱۹]

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور"۔ اُن کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی[۲۰] تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں[۲۱]۔ اور

کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ تیسرے یہ کہ ان کے پاس اُن کے اپنے ملک میں بھی رسول آئے اور گردو پیش کے ملکوں میں بھی آتے رہے۔

[۱۹] یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہو اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کرلیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ جس چیز کے لیے "تم بھیجے گئے ہو" اُسے ہم نہیں مانتے، محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور پھر ان کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ اُسی طرح کا طنزیہ انداز بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے متعلق اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (الشعراء: آیت ۲۷)، "یہ رسول صاحب جو تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورہ یٰس، حاشیہ نمبر ۱۱)

[۲۰] "منحوس دنوں" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے اور عذاب اس لیے آیا کہ یہ منحوس دن قوم عاد پر آ گئے تھے۔ یہ مطلب اگر ہوتا اور بجائے خود اُن دنوں ہی میں کوئی نحوست ہوتی تو عذاب دور و نزدیک کی ساری ہی قوموں پر آجاتا۔ اس لیے صحیح مطلب یہ ہے کہ اُن ایام میں چونکہ اس قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوا اس بنا پر وہ دن قوم عاد کے لیے منحوس تھے۔ اس آیت سے دنوں کے سعد و نحس پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے، وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔
رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی مگر انھوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر اُن کے کرتوتوں کی بدولت ذلّت کا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا
اور ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لاتے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے۲۲ ع۲

طوفانی ہوا کے لیے "ریحِ صرصر" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے معنی میں اہلِ لغت کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت لُو ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی ہوا ہے جس کے چلنے سے سخت شور برپا ہوتا ہو۔ بہر حال اس معنی پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ بہت تیز طوفانی ہوا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں (الحاقہ، آیت ۷)۔ جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی، اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا (الذاریات ۴۲،۲۰)۔ جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی اُس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے، بارش ہوگی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا (الاحقاف، ۲۴-۲۵)۔

۲۱ یہ ذلّت و رسوائی کا عذاب اُن کے اُس کبر و غرور کا جواب تھا جس کی بنا پر وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے تھے اور خم ٹھونک کر کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے۔ اللہ نے ان کو اس طرح ذلیل کیا کہ اُن کی آبادی کے بڑے حصے کو ہلاک کر دیا، اُن کے تمدّن کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا، اور ان کا قلیل حصّہ جو باقی رہ گیا وہ دنیا کی اُنہی قوموں کے آگے ذلیل و خوار ہوا جن پر کبھی یہ لوگ اپنا زور جتاتے تھے۔ (عاد کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۲ تا ۴۷، ۴۵۳ تا ۳۴۹ - جلد سوم، ص ۲۷۷ تا ۲۷۹ - ۵۱۰ تا ۵۲۰ - ۷۰۰)

۲۲ ثمود کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۸ تا ۵۰ - ۴۹۳ تا

اور ذرا اُس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔[۲۳] اُن کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا،[۲۴] پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دینگی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔[۲۵] وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف

۳۵۳-۵۱۵ تا ۵۱۶-۶۲۶-۶۲۷- جلد سوم، ص ۵۲۱ تا ۵۲۶-۵۸۱ تا ۵۸۶-

۲۳۔ اصل مدعا یہ کہنا ہے کہ جب وہ اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ لیکن اس مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ کیونکہ ان کا انجام آخر کار دوزخ ہی میں جانا ہے۔

۲۴۔ یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ایک ایک نسل اور ایک ایک پُشت کا حساب کر کے اس کا فیصلہ یکے بعد دیگرے کیا جاتا رہے، بلکہ تمام اگلی پچھلی نسلیں بیک وقت جمع کی جائیں گی اور ان سب کا اکٹھا حساب کیا جائیگا۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنی زندگی میں جو کچھ بھی اچھے اور بُرے اعمال کرتا ہے اس کے اثرات اس کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے بلکہ اس کے مرنے کے بعد بھی مدتہائے دراز تک چلتے رہتے ہیں اور وہ ان اثرات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نسل اپنے دور میں جو کچھ بھی کرتی ہے اس کے اثرات بعد کی نسلوں میں صدیوں جاری رہتے ہیں اور اپنے اس ورثے کے لیے وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ محاسبے اور انصاف کے لیے ان سارے ہی آثار و نتائج کا جائزہ لینا اور ان کی شہادتیں فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے قیامت کے روز نسل پر نسل آتی جائے گی اور ٹھیرائی جاتی رہے گی۔ عدالت کا کام اُس وقت شروع ہوگا جب اگلے پچھلے سب جمع ہو جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم ص ۲۶ تا ۲۹)

۲۵۔ احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائے گا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضاء ایک ایک کر کے شہادت دینگے کہ اُس نے ان سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت انسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا ہے اور مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم،

کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی" ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے[۲۶]۔ اُسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے

بزار وغیرہ محدثین نے ان روایات کو نقل کیا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد چہارم، یٰسٓ حاشیہ ۵۵۔

یہ آیت منجملہ اُن بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالمِ آخرت محض ایک روحانی عالم نہیں ہوگا بلکہ انسان وہاں دوبارہ اُسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب اِس دنیا میں ہیں۔ یہی نہیں، اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزاء اور جواہر (ATOMS) جن سے اُن کے بدن اِس دنیا میں مرکب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیئے جائیں گے اور وہ اپنے انہی سابق جسموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضاء وہاں اُسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جبکہ وہ وہی اعضاء ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی زندگی میں کسی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اِس مضمون پر قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیات بھی دلیلِ قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۴۹ تا ۵۱۔ ۹۸۔ المومنون، ۳۵ تا ۳۸۔ ۸۲۔ ۸۳۔ النور، ۲۴۔ السجدہ، ۱۰۔ یٰسٓ، ۶۵۔ ۷۸۔ ۷۹۔ الصافات، ۱۶ تا ۱۸۔ الواقعہ، ۴۷ تا ۵۰۔ النازعات، ۱۰ تا ۱۴۔

[۲۶] اِس سے معلوم ہوا کہ صرف انسان کے اپنے اعضاء ہی قیامت کے روز گواہی نہیں دینگے، بلکہ ہر وہ چیز بول اٹھے گی جس کے سامنے انسان نے کسی فعل کا ارتکاب کیا تھا۔ یہی بات سورۂ زلزال میں فرمائی گئی ہے کہ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا، يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا، بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔ "زمین وہ سارے بوجھ نکال پھینکے گی جو اس کے اندر بھرے پڑے ہیں، اور انسان کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اُس روز زمین اپنی ساری سرگزشت سنا دے گی (یعنی جو جو کچھ انسان نے اس کی پیٹھ پر کیا ہے اس کی ساری داستان بیان کر دے گی)، کیونکہ تیرا رب

ڈویا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے[۲۷] اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)، آگ ہی ان کا ٹھکانا ہوگی، اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انہیں نہ دیا جائے گا[۲۸] ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے تھے جو انہیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے،[۲۹] آخر کار

اسے بیان کرنے کا حکم دے چکا ہوگا۔

۲۷۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں خوب فرمایا ہے کہ ہر آدمی کا رویہ اس گمان کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے جو وہ اپنے رب کے متعلق قائم کرتا ہے۔ مومنِ صالح کا رویہ اس لیے درست ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے بارے میں صحیح گمان رکھتا ہے، اور کافر و منافق اور فاسق و ظالم کا رویہ اس لیے غلط ہوتا ہے کہ اپنے رب کے بارے میں اس کا گمان غلط ہوتا ہے۔ یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی جامع اور مختصر حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارا رب کہتا ہے انا عند ظن عبدی بی "میں اُس گمان کے ساتھ ہوں جو میرا بندہ مجھ سے رکھتا ہے" (بخاری و مسلم)۔

۲۸۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی طرف پلٹنا چاہیں گے تو نہ پلٹ سکیں گے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو نہ نکل سکیں گے، اور یہ بھی کہ توبہ اور معذرت کرنا چاہیں گے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

۲۹۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مستقل اور دائمی سنت ہے کہ وہ بُری نیت اور بُری خواہشات رکھنے والے انسانوں کو کبھی اچھے ساتھی نہیں دلواتا۔ بلکہ انہیں اُن کے اپنے رجحانات کے مطابق بُرے ساتھی ہی دلواتا ہے۔ پھر جتنے جتنے وہ بدی کی پستیوں میں گہرے اترتے جاتے ہیں اتنے ہی بدتر سے بدتر آدمی اور شیاطین ان کے ہم نشین اور مشیر اور رفیقِ کار بنتے چلے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاں صاحب بذاتِ خود تو بہت اچھے ہیں، مگر انہیں ساتھی بُرے مل گئے ہیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شخص کو ویسے ہی دوست ملتے ہیں جیسا وہ خود ہوتا ہے۔ ایک نیک آدمی کے ساتھ اگر برے لوگ لگ بھی جائیں تو وہ اس کے ساتھ زیادہ دیر تک لگے نہیں رہ سکتے۔ اور اسی طرح ایک بدنیت اور بدکردار آدمی کے ساتھ نیک اور شریف انسانوں کی

اُن پر بھی وہی فیصلۂ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں
کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا، یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے ع ۳ع
یہ منکرینِ حق کہتے ہیں "اِس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو
شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ" [۳۳] ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور

رفاقت اتفاقاً واقع ہو بھی جائے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نبھ سکتی۔ بدآدمی فطرۃً بدوں ہی کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور بد ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں، جس طرح غلاظت مکھیوں کو کھینچتی ہے اور مکھیاں غلاظت کی طرف کھنچتی ہیں۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ وہ آگے اور پیچھے ہر چیز اُن کو خوشنما بنا کر دکھاتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کو یقین دلاتے تھے کہ آپ کا ماضی بھی بڑا شاندار تھا اور مستقبل بھی نہایت درخشاں ہے۔ وہ ایسی عینک اُن کی آنکھوں پر چڑھاتے تھے کہ ہر طرف ان کو ہرا ہی ہرا نظر آتا تھا۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ آپ پر تنقید کرنے والے احمق ہیں، آپ کوئی نرالا کام تھوڑی کر رہے ہیں، دنیا میں ترقی کرنے والے وہی کچھ کرتے رہے ہیں جو آپ کر رہے ہیں، اور آگے اول تو کوئی آخرت ہے ہی نہیں جس میں آپ کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے، لیکن اگر وہ پیش آ ہی گئی، جیسا کہ چند نادان دعویٰ کرتے ہیں، تو جو خدا آپ کو یہاں نعمتوں سے نواز رہا ہے وہ وہاں بھی آپ پر انعام و اکرام کی بارش کرے گا۔ دوزخ آپ کے لیے نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے بنی ہے جنہیں یہاں خدا نے اپنی نعمتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

[۳۳] یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اس کا طرزِ ادا کس درجہ موثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اِس دل کش انداز میں اِس بے نظیر کلام کو جو سنے گا وہ آخر کار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔

جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اُسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِن کا گھر ہو گا۔ یہ ہے سزا اِس جُرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ "اے ہمارے رب، ذرا ہمیں دکھا دے اُن جِنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں[۳۱]"۔

جن[۳۲] لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے[۳۳]، یقیناً

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اُسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اِس تدبیر سے وہ امید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست دے دیں گے۔

۳۱؎ یعنی دنیا میں تو یہ لوگ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں اور فریب دینے والے شیاطین کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مگر جب قیامت کے روز انہیں پتہ چلے گا کہ یہ رہنما انہیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی لوگ انہیں کوسنے لگیں گے اور یہ چاہیں گے کہ وہ کسی طرح ان کے ہاتھ آجائیں تو پکڑ کر انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں۔

۳۲؎ یہاں تک کفار کو ان کی ہٹ دھرمی اور مخالفتِ حق کے نتائج پر متنبہ کرنے کے بعد اب اہلِ ایمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رُوئے سخن مڑتا ہے۔

۳۳؎ یعنی محض اتفاقاً کبھی اللہ کو اپنا رب کہہ کر نہیں رہ گئے، اور نہ اِس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا رب کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا رب بناتے بھی جائیں، بلکہ ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے، اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا، نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی، اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو پُورا کرتے رہے۔

توحید پر استقامت کا مفہوم کیا ہے، اس کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ نے

اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں[۳۴] اور ان سے کہتے ہیں کہ" نہ ڈرو، نہ غم کرو[۳۵]. اور خوش ہو جاؤ

اس طرح کی ہے:

حضرت انس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا قد قالها الناس ثم کفر اکثرهم، فمن مات علیها فهو ممن استقام " بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اسی عقیدے پر جما رہا" (ابن جریر، نسائی، ابن ابی حاتم)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: لم یشرکوا باللہ شیئاً، لم یلتفتوا الی الٰه غیره " پھر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا، اس کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف توجہ نہ کی" (ابن جریر)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا" خدا کی قسم استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ لومڑیوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے" (ابن جریر)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: " اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا" (کشاف)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: " اللہ کے عائد کردہ فرائض فرمانبرداری کے ساتھ ادا کرتے رہے" (کشاف)۔

[۳۴] فرشتوں کا یہ نزول ضروری نہیں ہے کہ کسی محسوس صورت میں ہو اور اہل ایمان اُنہیں آنکھوں سے دیکھیں یا ان کی آواز کانوں سے سنیں۔ اگرچہ اللہ جلّ شانہٗ جس کے لیے چاہے فرشتوں کو علانیہ بھی بھیج دیتا ہے لیکن بالعموم اہلِ ایمان پر، خصوصاً سخت وقتوں میں جبکہ دشمنانِ حق کے ہاتھوں وہ بہت تنگ ہو رہے ہوں، اُن کا نزول غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے، اور اُن کی باتیں کان کے پردوں سے ٹکرانے کے بجائے دل کی گہرائیوں میں سکینت و اطمینانِ قلب بن کر اترتی ہیں۔ بعض مفسّرین نے فرشتوں کے اِس نزول کو موت کے وقت، یا قبر، یا میدانِ حشر کے لیے مخصوص سمجھا ہے۔ لیکن اگر اُن حالات پر غور کیا جائے جن میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں، تو اِس میں کچھ شک نہیں رہتا کہ یہاں اس معاملہ کو بیان کرنے کا اصل مقصد اِس زندگی میں دینِ حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑاتے والوں کو

اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اِس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے
ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا
کرو گے وہ تمہاری ہو گی، یہ ہے سامانِ ضیافت اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔ ع ۴

فرشتوں کے نزول کا ذکر کرنا ہے، تاکہ انہیں تسکین حاصل ہو، اور ان کی ہمت بندھے۔

اور ان کے دل اس احساس سے مطمئن ہو جائیں کہ وہ بے یارو مددگار نہیں ہیں بلکہ اللہ کے فرشتے ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ فرشتے موت کے وقت بھی اہلِ ایمان کا استقبال کرنے آتے ہیں، اور قبر (عالمِ برزخ) میں بھی وہ ان کی پذیرائی کرتے ہیں، اور جس روز قیامت قائم ہو گی اُس روز بھی ابتدائے حشر سے جنت میں پہنچنے تک وہ برابر اُن کے ساتھ لگے رہیں گے، لیکن اُن کی یہ معیت اُسی عالم کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اِس دنیا میں بھی وہ جاری ہے۔ سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں جس طرح باطل پرستوں کے ساتھی شیاطین و اشرار ہوتے ہیں اُسی طرح اہلِ ایمان کے ساتھی فرشتے ہُوا کرتے ہیں۔ ایک طرف باطل پرستوں کو اُن کے ساتھی اُن کے کرتوت خوشنما بنا کر دکھاتے ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں کہ حق کو نیچا دکھانے کے لیے جو ظلم و ستم اور بے ایمانیاں تم کر رہے ہو، یہی تمہاری کامیابی کے ذرائع ہیں اور انہی سے دنیا میں تمہاری سرداری محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف حق پرستوں کے پاس اللہ کے فرشتے آ کر وہ پیغام دیتے ہیں جو آگے کے فقروں میں ارشاد ہو رہا ہے۔

۳۵ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جو دنیا سے لے کر آخرت تک ہر مرحلے میں اہلِ ایمان کے لیے تسکین کا ایک نیا مضمون اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اِس دنیا میں فرشتوں کی اس تلقین کا مطلب یہ ہے کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی بالا دست اور چیرہ دست ہوں، اُن سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو اور حق پرستی کی وجہ سے جو تکلیفیں اور محرومیاں بھی تمہیں سہنی پڑیں، ان پر کوئی رنج نہ کرو۔ کیونکہ آگے تمہارے لیے وہ کچھ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہی کلمات جب موت کے وقت فرشتے کہتے ہیں تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو وہاں

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں ۳۶؎

اور اے نبی، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہے۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔

تمہارے لیے کسی خوف کا مقام نہیں ہے، کیونکہ وہاں جنت تمہاری منتظر ہے، اور دنیا میں جن کو تم چھوڑ کر جارہے ہو اُن کے لیے تمہیں رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں ہم تمہارے ولی و رفیق ہیں۔ عالمِ برزخ اور میدانِ حشر میں جب فرشتے یہی کلمات کہیں گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہاں تمہارے لیے چین ہی چین ہے، دنیا کی زندگی میں جو حالات تم پر گزرے اُن کا غم نہ کرو اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا خوف نہ کھاؤ۔ اس لیے کہ ہم تمہیں اُس جنت کی بشارت دے رہے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔

۳۶؎ اہلِ ایمان کو تسکین دینے اور ان کی ہمت بندھانے کے بعد اب اُن کو اُن کے اصل کام کی طرف رغبت دلائی جارہی ہے۔ گزشتہ آیت میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہوجانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اُس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اب ان کو بتایا جارہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ

تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے[۳۷]۔ یہ

اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اٹھ کر کہے کہ مَیں مسلمان ہوں اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

۳۷؎ اِس ارشاد کی پُوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو، اور آپ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا جس میں اخلاق، انسانیت اور شرافت کی ساری حدیں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ ہر جھوٹ حضور اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف بولا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپ کو بدنام کرنے اور آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپ پر چسپاں کیے جا رہے تھے اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں جن سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ ہلّڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپ کی تاک میں لگا رہے اور جب آپ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپ کی بات نہ سن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کے توڑنے کا یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہے۔ یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اٹھا لائے ہوں جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی

نہیں. خود اُس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت ان کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اِس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخرکار وہ غالب آ کر رہتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ہی ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو جائیں، ایسی حالت میں تو ایک مدت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخرکار جگری دوست بن جائے گا۔ اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں تو بے شک یہ ایک نیکی ہوگی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور پھر مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچا لیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اِس

صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں[۳۸]، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں[۳۹]۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اُکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو[۴۰]، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۴۱]۔

قاعدہ کلیہ کو اس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ ان کی زیادتیوں کو درگزر کرنے اور ان کی بُرائی کا جواب احسان اور بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، ان کے نیشِ عقرب کا زہریلا پن ذرہ برابر بھی کم نہیں ہوتا۔ لیکن اس طرح کے شرِ مجسم انسان تقریباً اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسم انسان کمیاب ہیں۔

۳۸؎ یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوت برداشت، اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاندجانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں۔ وہاں بدی کا مقابلہ نیکی اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح سے اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، اور جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اُسے اُس کے مقامِ بلند سے نیچے اتار لانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

۳۹؎ یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے۔ اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اُسے دُنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں

روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔

نکلہ شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں، اور خصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کرا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب، برائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فلاں رکیک حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راستبازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں ان کی طرف سے کوئی بے جا حرکت، یا ان کے مرتبے سے گری ہوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو ان کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانا مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو۔ وہ بڑا دردمند و خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اِس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ

[۴۲] اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند[۴۳]۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اُس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اُسی کی

خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمد نے اپنی مُسنَد میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی کے ساتھ اُس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مُسکراتے رہے۔ آخر کار جنابِ صدّیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں اسے ایک سخت بات کہہ دی۔ ان کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضورؐ پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپ فوراً اٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اُٹھ کر آپ کے پیچھے ہو لیے اور راستے میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے، وہ مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپ ناراض ہوگئے فرمایا "جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آگیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

[۴۱] مخالفتوں کے طوفان میں اللہ کی پناہ مانگ لینے کے بعد جو چیز مومن کے دل میں صبر و سکون اور اطمینان کی ٹھنڈک پیدا کرتی ہے وہ یہی یقین ہے کہ اللہ بے خبر نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ہمارے ساتھ کیا جا رہا ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ ہماری اور ہمارے مخالفین کی ساری باتیں وہ سن رہا ہے اور دونوں کا طرزِ عمل جیسا کچھ بھی ہے اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اسی اعتماد پر بندۂ مومن اپنا اور دشمنانِ حق کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

یہ پانچواں موقع ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو دعوتِ دین

عبادت کرنے والے ہو۔[۴۴] لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پہ اڑے رہیں[۴۵] تو پروا نہیں
جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے[۴۶] ۔ سجدہ

اور اصلاحِ خلق کی یہ حکمت سکھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے کے چار مقامات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۱۱۰ تا ۱۱۴ - ۵۸۱ - ۵۸۲ - جلد سوم ص ۲۹۹ - ۷۰۸ - ۷۰۹ -

[۴۲] اب روئے سخن عوام الناس کی طرف مڑ رہا ہے اور چند فقرے ان کو حقیقت سمجھانے کے لیے ارشاد ہو رہے ہیں۔

[۴۳] یعنی یہ اللہ کے مظاہر نہیں ہیں کہ تم یہ سمجھتے ہوئے ان کی عبادت کرنے لگو کہ اللہ ان کی شکل میں خود اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے، بلکہ اللہ کی نشانیاں ہیں جن پر غور کرنے سے تم کائنات کی اور اس کے نظام کی حقیقت سمجھ سکتے ہو اور یہ جان سکتے ہو کہ انبیاء علیہم السلام جس توحیدِ خداوندی کی تعلیم دے رہے ہیں وہی امرِ واقعی ہے۔ سورج اور چاند سے پہلے رات اور دن کا ذکر اس امر پر متنبہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ رات کو سورج کا چھپنا اور چاند کا نکل آنا، اور دن کو چاند کا چھپنا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف طور پر یہ دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی خدا یا خدا کا مظہر نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی مجبور و لاچار بندے ہیں جو خدا کے قانون میں بندھے ہوئے گردش کر رہے ہیں۔

[۴۴] یہ جواب ہے اُس فلسفے کا جو شرک کو معقول ثابت کرنے کے لیے کچھ زیادہ ذہین قسم کے مشرکین عموماً بگھارا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اِن چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر تم واقعی اللہ ہی کے عبادت گزار ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، براہِ راست خود اسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے۔

[۴۵] "غرور میں آکر" سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ تمہاری بات مان لینے میں اپنی ذلت سمجھ کر اُسی جہالت پر اصرار کیے چلے جائیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔

[۴۶] مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام، جو اِن فرشتوں کے ذریعہ سے چل رہا ہے، اللہ کی

اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سُونی پڑی ہوئی ہے، پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا، یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جِلا اٹھاتا ہے وہ مُردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔[۴۸] یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں[۴۹] وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔[۵۰] خود

توحید اور اسی کی بندگی میں رواں دواں ہے، اور اِس نظام کے منتظم فرشتے ہر آن یہ شہادت دے رہے ہیں کہ ان کا رب اِس سے پاک اور منزّہ ہے کہ کوئی خداوندی اور معبودیت میں اس کا شریک ہو۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں مانتے اور ساری کائنات جس راستے پر چل رہی ہے اُس سے منہ موڑ کر شرک ہی کی راہ چلنے پر اصرار کیے جاتے ہیں تو پڑا رہنے دو ان کو اپنی اِس حماقت میں۔

اس مقام کے متعلق یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ یہاں سجدہ لازم آتا ہے، مگر اِس امر میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوگیا ہے کہ اوپر کی دونوں آیتوں میں سے کس پر سجدہ کرنا چاہیے۔ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے تھے۔ اِسی قول کو امام مالک نے اختیار کیا ہے، اور ایک قول امام شافعی سے بھی اسی کی تائید میں منقول ہے۔ لیکن حضرات ابن عباس، ابن عمر، سعید بن المسیّب، مسروق، قتادہ، حسن بصری، ابوعبدالرحمٰن السُّلَمی، ابن سیرین، ابراہیم نخعی اور متعدد دوسرے اکابر وَھُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ پر سجدے کے قائل ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی ہے اور شافعیوں کے ہاں بھی مرجّح قول یہی ہے۔

[۴۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۴۹-۵۵۰۔ جلد سوم، ص ۲۰۲ تا ۲۰۵-۴۲۲-۴۷۳۔ جلد چہارم، فاطر، حاشیہ ۱۹۔

[۴۹] عوام الناس کو چند فقروں میں یہ سمجھانے کے بعد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس توحید اور آخرت کے عقیدے کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہی معقول ہے اور آثارِ کائنات اسی کے حق ہونے کی شہادت دے رہے ہیں، اب رُوئے سخن پھر اُن مخالفین کی طرف مُڑتا ہے جو پوری ہٹ دھرمی کے ساتھ مخالفت پر

ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلامِ نصیحت آیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے[۵۱]، باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے[۵۲]، یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔

نکلے ہوئے تھے۔

۴۹؎ اصل الفاظ ہیں یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا (ہماری آیات میں الحاد کرتے ہیں)۔ الحاد کے معنی ہیں انحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج روی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی ان کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ کفارِ مکہ قرآن مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات کو سن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کر کے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو، آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔

۵۰؎ ان الفاظ میں ایک سخت دھمکی مضمر ہے۔ حاکم ذی اقتدار کا یہ کہنا کہ فلاں شخص جو حرکتیں کر رہا ہے وہ مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں، آپ سے آپ یہ معنی اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔

۵۱؎ یعنی اٹل ہے۔ اِس کو اُن چالوں سے شکست نہیں دی جا سکتی جو باطل پرست لوگ اِس کے خلاف چل رہے ہیں۔ اِس میں صداقت کا زور ہے۔ علمِ حق کا زور ہے۔ دلیل و حجت کا زور ہے۔ زبان اور بیان کا زور ہے۔ بھیجنے والے خدا کی خدائی کا زور ہے۔ اور پیش کرنے والے رسول کی شخصیت کا زور ہے۔ جھوٹ اور کھوکھلے پروپیگنڈے کے ہتھیاروں سے کوئی اِسے زک دینا چاہے تو کیسے دے سکتا ہے۔

۵۲؎ سامنے سے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے اگر کوئی شخص اُس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے

اے نبی، تم سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے[۵۴] اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی"[۵۵] ان سے کہو یہ قرآن ایمان

سے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آسکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی نفی کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مُدن کے باب میں انسان کو جو رہنمائی دی ہے وہ غلط ہے۔ اس کتاب نے جس چیز کو حق کہہ دیا ہے وہ کبھی باطل ثابت نہیں ہو سکتی اور جسے باطل کہہ دیا ہے وہ کبھی حق ثابت نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ باطل خواہ سامنے سے آکر حملہ آور ہو یا ہیر پھیر کے راستوں سے چھاپے مارے، بہر حال کسی طرح بھی وہ اُس دعوت کو شکست نہیں دے سکتا جسے لے کر قرآن آیا ہے۔ تمام مخالفتوں اور مخالفین کی ساری خفیہ اور علانیہ چالوں کے علی الرغم یہ دعوت پھیل کر رہے گی اور کوئی اسے زک نہیں دے سکے گا۔

۵۴ یعنی یہ اُس کا حلم اور عفو و درگزر ہی ہے کہ اس کے رسولوں کو جھٹلایا گیا، گالیاں دی گئیں، اذیتیں پہنچائی گئیں اور پھر بھی وہ سالہا سال تک مخالفین کو مہلت دیتا چلا گیا۔

۵۵ یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام انہوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ ان پر خدا نے نازل کیا ہے۔ ان کے اس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اُس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رومی

لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ
اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دُور سے پکارا جا رہا ہو۔[۵۵] ع۵ اِس سے
پہلے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔[۵۶] اگر تیرے
رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ چکا
دیا جاتا۔[۵۷] اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے

یا یونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب اِن کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعہ سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا۔ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے، عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے نہ قوم۔

۵۵؎ دُور سے جب کسی کو پکارا جاتا ہے تو اس کے کان میں ایک آواز تو پڑتی ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسی بے نظیر تشبیہ ہے جس سے ہٹ دھرم مخالفین کے نفسیات کی پُوری تصویر نگاہوں کے سامنے کھچ جاتی ہے۔ فطری بات ہے کہ جو شخص کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہوتا اُس سے اگر آپ گفتگو کریں تو وہ اسے سنتا ہے، سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور معقول بات ہوتی ہے تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آپ کے خلاف نہ صرف تعصب بلکہ عناد اور بغض رکھتا ہو اس کو آپ اپنی بات سمجھانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ سرے سے اُس کی طرف توجہ ہی نہ کرے گا۔ آپ کی ساری بات سُن کر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آئے گا کہ آپ اتنی دیر تک کیا کہتے رہے ہیں۔ اور آپ کو بھی یُوں محسوس ہو گا کہ جیسے آپ کی آواز اُس کے کان کے پردوں سے اُچٹ کر باہر ہی باہر گزرتی رہی ہے، دل اور دماغ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں پا سکی۔

۵۶؎ یعنی کچھ لوگوں نے اسے مانا تھا اور کچھ مخالفت پر تُل گئے تھے۔

۵۷؎ اس ارشاد کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ لوگوں

ہوئے ہیں۔[۵۸]

جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا، جو بدی کرے گا اس کا وبال اُسی پر ہوگا، اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے۔[۵۹]

کو سوچنے سمجھنے کے لیے کافی مہلت دی جائے گی تو اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ نے پہلے ہی یہ طے نہ کر لیا ہوتا کہ اختلافات کا آخری فیصلہ قیامت کے روز کیا جائے گا تو دنیا ہی میں حقیقت کو بے نقاب کر دیا جاتا اور یہ بات کھول دی جاتی کہ حق پر کون ہے اور باطل پہ کون۔

۵۸۔ اس مختصر سے فقرے میں کفارِ مکہ کے مرض کی پوری تشخیص کر دی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس شک نے ان کو سخت خلجان و اضطراب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو وہ بڑے زور شور سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا انکار کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کا یہ انکار کسی یقین کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ ان کے دلوں میں شدید تذبذب برپا ہے۔ ایک طرف ان کے ذاتی مفاد، ان کے نفس کی خواہشات، اور ان کے جاہلانہ تعصبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلائیں اور پوری طاقت کے ساتھ ان کی مخالفت کریں۔ دوسری طرف ان کے دل اندر سے پکارتے ہیں کہ یہ قرآن فی الواقع ایک بے مثل کلام ہے جس کے مانند کوئی کلام کسی ادیب یا شاعر سے کبھی نہیں سنا گیا ہے، نہ کوئی مجنون دیوانگی کے عالم میں ایسی باتیں کر سکتا ہے، نہ کبھی شیاطین اس غرض کے لیے آسکتے ہیں کہ لوگوں کو خدا پرستی اور نیکی و پاکیزگی کی تعلیم دیں۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وہ جھوٹا کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ خدا کے بندو کچھ شرم کرو، کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے؟ جب وہ ان کو مجنون کہتے ہیں تو ان کا دل اندر سے پکارتا ہے کہ ظالمو، کیا واقعی تم اس شخص کو دیوانہ سمجھتے ہو؟ جب وہ ان پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ حق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بڑائی کے لیے کر رہے ہیں تو اُن کا دل اندر سے ملامت کرتا ہے کہ لعنت ہے تم پر، اس نیک نفس انسان

قرآن کی سیاسی تعلیمات

ابوالاعلیٰ مودودی

۱۔ تصوّرِ کائنات سیاست کے متعلق قرآن کا نظریہ اس کے اساسی تصوّرِ کائنات پر مبنی ہے جسے نگاہ میں رکھنا اس نظریہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ فلسفۂ سیاست کے نقطۂ نظر سے اگر اس تصوّرِ کائنات کا جائزہ لیا جائے تو حسبِ ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

(الف) اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اور خود انسان کا اور اُن تمام چیزوں کا خالق ہے جن سے انسان اس دنیا میں متنفید ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۶:۷۳)	اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔
قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۳:۱۶)	کہو، اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی یکتا ہے سب کو مغلوب کرکے رکھنے والا۔

(بقیہ تفہیم القرآن)

کو بندۂ غرض کہتے ہو جسے کبھی تم نے دولت اور اقتدار اور نام و نمود کے لیے دوڑ دھوپ کرتے نہیں دیکھا ہے، جس کی ساری زندگی مفاد پرستی کے ہر شائبے سے پاک رہی ہے، جس نے ہمیشہ نیکی اور بھلائی کے لیے کام کیا ہے مگر کبھی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے کوئی بے جا کام نہیں کیا۔

۵۹ یعنی تیرا رب کبھی یہ ظلم نہیں کر سکتا کہ نیک انسان کی نیکی ضائع کر دے اور بدی کرنے والوں کو ان کی بدی کا بدلہ نہ دے۔

يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَآءً (۴ : ۱)

لوگو، ڈرو اپنے اُس رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُس سے اُس کا جوڑا وجود میں لایا اور اُن دونوں سے اُس نے بکثرت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۲ : ۲۹)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں۔

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ (۳۵ : ۳)

کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان وزمین سے رزق دیتا ہو؟

أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ .... أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ .... أَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ .... أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ۔ (۵۶ : ۵۸ - ۷۲)

کیا تم نے غور کیا، یہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو اس سے بچہ تم پیدا کرتے ہو یا اس کے خالق ہم ہیں؟ ... تم نے غور کیا، یہ کھیتی جو تم بوتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا اس کے اگانے والے ہم ہیں؟ ... تم نے غور کیا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے بادل سے تم برساتے ہو یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ .... تم نے غور کیا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو اس کے درخت تم نے پیدا کیے ہیں یا ان کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟

رب، اپنی پیدا کردہ اس خلق کا مالک، فرمانروا اور مُدبّر و منتظم بھی اللہ ہی ہے:

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ۔ (۲۰ : ۸)

اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کی تہ میں (UNDER GROUND) ہے۔

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (۳۰ : ۲۶)	اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُس کے مطیعِ فرمان ہیں۔
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۷ : ۵۴)	سورج اور چاند اور تاروں کو اس نے پیدا کیا، سب اس کے حکم سے مسخر ہیں۔ خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کی حکمرانی ہے۔ بڑا بابرکت ہے اللہ رب العالمین۔
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (۳۲ : ۵)	آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام وہ کرتا ہے

(ج) اس کائنات میں حاکمیت ایک اللہ کے سوا نہ کسی کی ہے، نہ ہو سکتی ہے اور نہ کسی کا یہ حق ہے کہ حاکمیت میں اس کا کوئی حصہ ہو:

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲ : ۱۰۷)	کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (۲۵ : ۲)	اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔
لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۷۰)	دنیا اور آخرت میں ساری تعریف اسی کے لیے ہے اور حکم کا اختیار اسی کو ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶ : ۵۷)	فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔
مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸ : ۲۶)	بندوں کے لیے اُس کے سوا کوئی ولی و سرپرست نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (۳ : ۱۵۴)	وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختیار میں بھی کچھ ہے؟ کہو، اختیار سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے۔

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ (۳۰:۴)

اللہ ہی کے ہاتھ اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۵۷:۵)

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۱۶:۱۷)

کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اُس کی طرح ہو سکتا ہے جو پیدا نہیں کرتا ؟ تم ہوش میں نہیں آتے ؟

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (۱۳:۱۶)

کیا ان لوگوں نے اللہ کے کچھ ایسے شریک بنا لیے ہیں جنہوں نے اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہو اور اِن پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہو ؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ .... اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (۳۵: ۴۰-۴۱)

کہو، کبھی تم نے اپنے ٹھیراتے ہوئے ان شریکوں کو دیکھا جنہیں تم اللہ کے سوا (رب کی حیثیت سے) پکارتے ہو ؟ مجھے دکھاؤ انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے ؟ .... درحقیقت اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو زائل ہونے سے روکے ہوئے ہے، اور اگر وہ زائل ہونے لگیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا نہیں ہے جو انہیں روک سکے۔

(د) حاکمیت کی جملہ صفات اور جملہ اختیارات صرف ایک اللہ ہی میں مرکوز ہیں، اس کائنات میں کوئی ان صفات و اختیارات کا حامل سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہی سب پر غالب ہے۔ سب کچھ جاننے والا ہے۔ بے عیب اور بے خطا ہے۔ سب کا نگہبان ہے۔ سب کو امان دینے والا ہے ہمیشہ زندہ اور ہر وقت بیدار ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر شے چار و ناچار اس کی تابع فرمان ہے۔ نفع اور ضرر سب اس کے اختیار میں ہیں۔ کوئی اس کے

سوا اور اس کے اذن کے بغیر نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے آگے سفارش تک نہیں کر سکتا۔ وہ جس سے چاہے مواخذہ کرے اور جسے چاہے معاف کر دے۔ اس کے حکم پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں اور سب اس کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے اور کوئی اس کے حکم کو ٹالنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ حاکمیت کی یہ تمام صفات صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ۔ (۶ : ۱۸)

وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا ہے اور وہی دانا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ۔ (۱۳ : ۹)

پوشیدہ اور ظاہر سب چیزوں کا جاننے والا، بزرگ اور بالاتر رہنے والا۔

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ (۵۹ : ۲۳)

بادشاہ، عیب و نقص سے پاک، غلطی سے مبرا، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بزور حکم نافذ کرنے والا، کبریائی کا مالک۔

اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ، لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ۔ (۲ : ۲۵۵)

ہمیشہ زندہ، اپنے بل پر آپ قائم، نہ اس کو اونگھ آتی نہ نیند لاحق ہو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سفارش کرے؟ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶۷ : ۱)

بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (۳۶: ۸۳)	جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔
وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۳: ۸۳)	آسمانوں اور زمین کے سب رہنے والے چار و ناچار اسی کے تابع فرمان ہیں۔
اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا، هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۱۰: ۶۵)	طاقت بالکل اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔
قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا (۴۸: ۱۱)	کہو، اگر اللہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کون اس سے تمہیں کچھ بھی بچا سکتا ہے؟ یا اگر وہ تمہیں نفع پہنچانا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (۱۰: ۱۰۷)	اگر اللہ تجھے ضرر پہنچائے تو اسے دور کرنے والا خود اللہ ہی کے سوا کوئی نہیں ہے اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو پھیر دینے والا بھی کوئی نہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل فرماتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔
وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲: ۲۸۴)	تم خواہ اپنے دل کی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ اُس کا محاسبہ تم سے کریگا، پھر جسے چاہے وہ معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔
اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ	کمال درجہ کا دیکھنے اور سننے والا۔ اس کے سوا کوئی بندوں کا ولی و سرپرست نہیں، اور وہ

اَحَدًا (۱۸ : ۲۶)	اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔
قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ	کہو، مجھے کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا اور نہ اس کے
وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (۷۲ : ۲۲)	سوا میں کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔
وَھُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْہِ	وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں
(۲۳ : ۸۸)	دی جا سکتی۔
اِنَّہٗ ھُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ وَھُوَ	وہی ابتدا کرتا ہے اور وہی اعادہ کرتا ہے۔ اور
الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ	وہی بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے تخت
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ (۸۵ : ۱۳-۱۶)	سلطنت کا مالک اور بزرگ، جو کچھ چاہے
	کر گزرنے والا۔
اِنَّ اللّٰہَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ (۵ : ۱)	بے شک اللہ جو کچھ چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔
وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ	اللہ فیصلہ کرتا ہے اور کوئی اس کے فیصلہ پر نظر
(۱۳ : ۴۱)	ثانی کرنے والا نہیں ہے۔
لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ	جو کچھ وہ کرتا ہے اس پر کسی کے سامنے وہ جوابدہ
یُسْئَلُوْنَ۔ (۲۱ : ۲۳)	نہیں ہے اور دوسرے سب جوابدہ ہیں۔
لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ	اس کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں اور تو اس کے
دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (۱۸ : ۲۷)	مقابلے میں کوئی جائے پناہ نہیں پا سکتا۔
اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ (۹۵ : ۸)	کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟
قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی	کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے
الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ	اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے
تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ	اور جسے چاہے ذلیل کر دے، ساری بھلائی تیرے
بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (۳ : ۲۶)	اختیار میں ہے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۷ : ۱۲۸)	درحقیقت زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

۲ - حاکمیت الٰہیہ کائنات کے اسی تصور کی بنیاد پر قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کا حقیقی فرمانروا اور حاکم بھی وہی ہے جو کائنات کا حاکم و فرمانروا ہے۔ انسانی معاملات میں بھی حاکمیت کا حق اُسی کو پہنچتا ہے۔ اور اس کے سوا کوئی انسانی یا غیر انسانی طاقت بطور خود حکم دینے اور فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ نظامِ کائنات میں تو اللہ کی حاکمیت و فرمانروائی اپنے زور پر آپ قائم ہے جو کسی کے اعتراف کی محتاج نہیں ہے، اور خود انسان بھی اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصے میں طبعاً اس کی حاکمیت و فرمانروائی کا اسی طرح مطیع ہے جس طرح ایک ذرّے سے لے کر کہکشانی نظاموں تک ہر چیز اس کی مطیع ہے، لیکن انسان کی زندگی کے اختیاری حصے میں وہ اپنی اِس حاکمیت کو بزور مسلط نہیں کرتا بلکہ الہامی کتابوں کے ذریعہ سے، جن میں آخری کتاب یہ قرآن ہے، اُن کو دعوت دیتا ہے کہ شعور و ارادہ کے ساتھ اس کی حاکمیت تسلیم اور اس کی اطاعت اختیار کریں۔ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں کو قرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(الف) یہ کہ کائنات کا رب ہی درحقیقت انسان کا رب ہے اور اُسی کی ربوبیت تسلیم کی جانی چاہیے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔۔۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (۶ : ۱۶۴)	کہو، میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔۔۔ کہو، کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب تو وہی ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ (۷ : ۵۴)

درحقیقت تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلٰهِ النَّاسِ۔ (۱۱۴ : ۱-۳)

کہو، مَیں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ۔ انسانوں کے معبود کی۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ (۱۰ : ۳۱)

کہو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون دنیا کا انتظام چلاتا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم ڈرتے نہیں؟ پھر تو وہ اللہ ہی تمہارا حقیقی رب ہے۔ آخر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے، تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

(ب) یہ کہ حکم اور فیصلے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اُسی کی بندگی انسانوں کو کرنی چاہیے اور یہی صحیح طریقِ کار ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ (۴۲ : ۱۰)

تمہارے درمیان جو اختلاف بھی ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۱۲ : ۴۰)

حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (۳ : ۱۵۴)

وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟ کہو، اختیار سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے

(ج) یہ کہ حکم دینے کا حق اللہ کو اس لیے ہے کہ وہی خالق ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷ : ۵۴)

خبردار، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

(د) یہ کہ حکم دینے کا حق اللہ کو اس لیے ہے کہ وہی کائنات کا بادشاہ ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا ... اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵ : ۳۸-۴۰)

چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو... کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے۔

(ھ) یہ کہ اللہ کا حکم اس لیے برحق ہے کہ وہی حقیقت کا علم رکھتا ہے اور وہی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے:

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲ : ۲۱۶)

ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۔ (۲ : ۲۲۰)

اللہ ہی جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔ (۲ : ۲۵۵)

جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ اور اس کے علم میں سے کسی چیز کا وہ احاطہ نہیں کر سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا وہ علم دینا چاہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ . . . ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۲ : ۲۳۲)

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کی مدت کو پہنچ جائیں تو انہیں (اپنی پسند کے) شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو . . . یہ تمہارے لیے زیادہ شائستہ اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ . . . اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (۴ : ۱۱)

اللہ تمہاری اولاد کے معاملہ میں تم کو ہدایت دیتا ہے . . . تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے، اس کو تم نہیں جانتے۔ وراثت کا حصہ اللہ نے مقرر کر دیا ہے، یقیناً اللہ سب کچھ جانتا ہے اور دانا ہے۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ . . . يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴ : ۱۷۶)

وہ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ کلالہ کے معاملہ میں تمہیں فتویٰ دیتا ہے . . . اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (۸ : ۷۵)

اللہ کی کتاب میں رشتہ دار (دوسروں کی بہ نسبت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ . . . فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

صدقات تو فقراء کے لیے ہیں . . . یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا قاعدہ ہے اور اللہ سب

حَكِيمٌ۔ (۹ : ۶۰) کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ . . . كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۲۴ : ۵۸-۵۹)

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تمہارے غلام تمہارے پاس اجازت لے کر آئیں . . . اس طرح اللہ تمہیں احکام کھول کر بتاتا ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ . . . ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۶۰ : ۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں ان کا امتحان لو . . . یہ اللہ کا حکم ہے، وہ تمہارے معاملات میں فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا ہے۔

۳- اللہ کی قانونی حاکمیت ان وجوہ سے قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ اطاعت خالصتہً اللہ کی اور پیروی اسی کے قانون کی ہونی چاہیے۔ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی، یا اپنی خواہشات نفس کی پیروی ممنوع ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (۳۹ : ۲)

اے نبی، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے پس تم دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرو۔ خبردار، دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُونَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِينَ (۳۹ : ۱۱-۱۲)

کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے سر اطاعت جھکا دینے والا میں ہوں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (۱۶: ۳۶)

ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔[1]

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (۹۸: ۵)

اُن کو کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا کہ یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں دین کو اُس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔

اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷: ۳)

پیروی کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے تمہارے رب کی طرف سے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۱۳: ۳۷)

اور اگر تو نے اُس علم کے بعد جو تیرے پاس آ چکا ہے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلہ میں نہ تیرا کوئی حامی ہوگا نہ بچانے والا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵: ۱۸)

پھر ہم نے تجھ کو دین کے ایک خاص طریقے پر قائم کر دیا پس تو اسی کی پیروی کر اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے۔

وہ کہتا ہے کہ اللہ نے انسانی معاملات کو منضبط کرنے کے لیے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے:

---

[1] "ہر وہ ہستی جو اللہ کے مقابلہ میں سرکشی کرے اور اللہ کے سوا جس کی بندگی کی جائے، خواہ بندگی کرنے والا اس کے جبر سے مجبور ہو کر اس کی بندگی کرے یا اپنی رضا و رغبت سے ایسا کرے، وہ طاغوت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان یا بت یا اور کوئی چیز۔"

(ابن جریر الطبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن۔ ج ۳ ص ۱۳، مطبعۃ الامیریہ، مصر، ۱۳۲۴ھ)

... تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲ : ۲۲۹)	... یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔
... تِلْكَ حُدُودُ اللهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵ : ۱)	... یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ کی حد سے تجاوز کرے اس نے اپنے نفس پر خود ظلم کیا۔
... وَتِلْكَ حُدُودُ اللهِ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۵۸ : ۴)	... یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور پابندی سے انکار کرنے والوں کے لیے دردناک سزا ہے۔

نیز وہ کہتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف جو حکم بھی ہے نہ صرف غلط اور ناجائز ہے بلکہ کفر وضلالت اور ظلم وفسق ہے۔ اس طرح کا ہر فیصلہ جاہلیت کا فیصلہ ہے جس کا انکار لازمۂ ایمان ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ - (۵ : ۴۴)	اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵ : ۴۵)	اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۵ : ۴۶)	اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵ - ۵۰)	کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ	کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس کتاب پر

مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَّكْفُرُوا بِهٖ وَيُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيدًا (۴ : ۶۰)	جو تیری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل کی گئی تھیں، اور پھر چاہتے ہیں کہ فیصلے کے لیے اپنا معاملہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں اس کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر گمراہی میں دُور لے جائے۔

۴۔ **رسُول کی حیثیت** خدا کا وہ قانون، جس کی پیروی کا اوپر کی آیتوں میں حکم دیا گیا ہے، انسان تک اس کے پہنچنے کا ذریعہ صرف اس کا رسول ہے۔ وہی خدا کی طرف سے اس کے احکام اور اس کی ہدایات انسانوں کو پہنچاتا ہے اور وہی اپنے قول اور عمل سے ان احکام وہدایات کی تشریح کرتا ہے۔ پس رسول انسانی زندگی میں خدا کی قانونی حاکمیت (LEGAL SOVEREIGNTY) کا نمائندہ ہے اور اس بنا پر اس کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ خدا ہی کا یہ حکم ہے کہ رسول کے امر و نہی اور اس کے فیصلوں کو بے چون وچرا تسلیم کیا جائے، حتیٰ کہ ان پر دل میں بھی ناگواری پیدا نہ ہو، ورنہ ایمان کی خیر نہیں ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ (۴ : ۶۴)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔
وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (۴ : ۸۰)	اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔
وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (۴ : ۱۱۵)	اور جو کوئی رسول سے اختلاف کرے جبکہ ہدایت اس پر واضح ہو چکی ہو اور ایمان لانے والوں کی روش چھوڑ کر دوسری راہ چلے اسے ہم اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اس کو جہنم

میں جھونکیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۵۹: ۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۴: ۶۵)

پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ (اے نبی) وہ تجھے اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں بھی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سربسر تسلیم کریں۔

۵۔ بالاتر قانون خدا اور رسول کا حکم قرآن کی رُو سے وہ بالاتر قانون (SUPREME LAW) ہے جس کے مقابلہ میں اہلِ ایمان صرف اطاعت ہی کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ جن معاملات میں خدا اور رسول اپنا فیصلہ دے چکے ہیں ان میں کوئی مسلمان خود آزادانہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اس فیصلے سے انحراف ایمان کی ضد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا۔ (۳۳: ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اپنے اُس معاملے میں ان کے لیے کوئی اختیار باقی رہ جائے، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا

وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ وَإِذَا دُعُوا إِلَى

وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور رسول پر اور ہم نے اطاعت قبول کی، پھر اس کے بعد ان میں سے ایک فریق منہ موڑتا ہے۔ یہ لوگ ہرگز

اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔

(۲۴ : ۴۷-۴۸)

مومن نہیں ہیں۔ اور جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق مُنہ موڑ جاتا ہے

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۲۴ : ۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۶۔ **خلافت** انسانی حکومت کی صحیح صورت قرآن کے مطابق صرف یہ ہے کہ ریاست خدا اور رسول کی قانونی بالادستی تسلیم کر کے اُس کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہو جائے۔ اور حاکمِ حقیقی کے تحت "خلافت" (نیابت) کی حیثیت قبول کرے۔ اِس حیثیت میں اس کے اختیارات، خواہ وہ تشریعی ہوں یا عدالتی یا انتظامی، لازماً اُن حدود سے محدود ہوں گے جو اوپر پیراگراف ۳، ۴ اور ۵ میں بیان ہوتے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَیْمِنًا عَلَیْهِ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ

(۵ : ۴۸)

(اے نبیؐ) ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان ہے اُن پر۔ پس جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے تم اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی میں اس حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے پاس آیا ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۳۸ : ۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا لے جائے

۷۔ **خلافت کی حقیقت** اس خلافت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زمین میں انسان کو جو قدرتیں بھی حاصل ہیں خدا کی عطا اور بخشش سے حاصل ہیں۔ خدا نے خود انسان کو اس حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دیئے ہوئے اختیار سے اس کی زمین میں استعمال کرے۔ اس لیے انسان یہاں خود مختار مالک نہیں بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (۲: ۳۰)

اور یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ (۷: ۱۰)

(اے انسانو) ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے اس میں سامان زیست فراہم کیے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ (۲۲: ۶۵)

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے تمہارے لیے وہ سب کچھ مسخر کر دیا جو زمین میں ہے۔

ہر وہ قوم جسے زمین کے کسی حصہ میں اقتدار حاصل ہوتا ہے، دراصل وہاں خدا کی خلیفہ ہوتی ہے:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷: ۶۹)

(اے قوم عاد) یاد کرو جبکہ اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد خلیفہ بنایا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ۔ (۷: ۷۴)

(اور اے قوم ثمود) یاد کرو جبکہ اس نے تمہیں عاد کے بعد خلیفہ بنایا۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷: ۱۲۹)

(اے بنی اسرائیل) قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن (فرعون) کو ہلاک کرے اور زمین میں تم کو خلیفہ بنائے اور پھر

دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷: ۱۲۹)

پھر ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔

لیکن یہ خلافت صحیح اور جائز خلافت صرف اُسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ یہ مالک حقیقی کے حکم کی تابع ہو۔ اُس سے روگردانی کر کے جو خود مختارانہ نظام حکومت بنایا جائے وہ خلافت کے بجائے بغاوت بن جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَلَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا۔ (۳۵: ۳۹)

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ پھر جو کفر کرے تو اس کا کفر اسی پر وبال ہے اور اللہ کے ہاں کافروں کے حق میں ان کا کفر کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا مگر خدا کے غضب میں، اور کافروں کے لیے ان کا کفر کوئی چیز نہیں بڑھاتا مگر خسارہ۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ... وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ (۸۹: ۶-۱۱)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کیا کیا عاد کے ساتھ.... اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں پتھر تراشے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی کی؟

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى... فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹: ۱۷-۲۴)

(اے موسیٰ) جا فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے.... فرعون نے کہا کہ میں تمہارا رب برتر ہوں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے

الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ... يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (۲۴ : ۵۵)

کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا... وہ میری بندگی کریں، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔

۸ - اجتماعی خلافت | اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت (COMMUNTY) اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے جس نے مذکورۂ بالا اصولوں کو تسلیم کرکے اپنی ریاست قائم کی ہو۔ آیت ۲۴ : ۵۵ کے الفاظ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ اس معاملہ میں صریح ہیں۔ اس فقرے کی رُو سے اہلِ ایمان کی جماعت کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصّہ دار ہے۔ کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کرکے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے، نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور پیشوائیت سے الگ کرکے اسے جمہوریت کے رُخ پر موڑتی ہے۔ لیکن اس میں اور مغربی تصوّرِ جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت (POPULAR SOVEREIGNTY) کے اصول پر قائم ہوتی ہے، اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں خود عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کرکے اپنے اختیارات کو برضا و رغبت قانونِ خداوندی کے حدود میں محدود کر لیتے ہیں۔

۹ - ریاست کی اطاعت کے حدود | اس نظامِ خلافت کو چلانے کے لیے جو ریاست قائم ہوگی، عوام اس کی صرف اطاعت فی المعروف کے پابند ہوں گے، معصیت (قانون کی خلاف ورزی) میں نہ کوئی اطاعت ہے اور نہ تعاون۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ ...

اے نبی، جب ایمان لانے والی عورتیں تمہارے پاس ان باتوں پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ (۶۰: ۱۲)	وہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کریں گی .... اور کسی جائز حکم میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان کی بیعت قبول کر لو۔
تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۵: ۲)	نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔
وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا (۷۶: ۲۴)	ان میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کی اطاعت نہ کرو۔

۱۰۔ شوریٰ | اس ریاست کا پورا کام، اس کی تاسیس و تشکیل سے لے کر رئیس مملکت اور اولی الامر کے انتخاب اور تشریعی و انتظامی معاملات تک، اہل ایمان کے باہمی مشورے سے چلنا چاہیے، قطع نظر اس سے کہ یہ مشاورت بلاواسطہ ہو یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲: ۳۸)	اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے چلتا ہے۔

۱۱۔ اولی الامر کی صفات | اس ریاست کا نظام چلانے کے لیے اولی الامر کے انتخاب میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیے وہ یہ ہیں:

(الف) وہ ان اصولوں کو مانتے ہوں جن کے مطابق خلافت کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جارہی ہے، اس لیے کہ ایک نظام کو چلانے کی ذمہ داری اس کے اصولی مخالفین پر نہیں ڈالی جاسکتی:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (۴: ۵۹)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے سوا کسی دوسرے کو شریک راز نہ

دُوْنِكُمْ (۳ : ۱۱۸)

بنالو۔[1]

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً (۹ : ۱۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائیگا حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور رسولؐ اور اہل ایمان کے سوا کسی کو اپنے معاملات میں دخیل[2] نہیں بنایا۔

(ب) یہ کہ وہ ظالم، فاسق و فاجر، خدا سے غافل اور حد سے گزر جانے والے نہ ہوں بلکہ ایماندار، خداترس اور نیکوکار ہوں۔ کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت یا امامت کے منصب پر قابض ہوجائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے وہ پوری کر دیں تو رب نے فرمایا میں تجھے لوگوں کا امام بنانے

---

[1] اصل میں لفظ بِطَانَۃً استعمال ہوا ہے۔ الزمخشری (م ۵۳۸ھ/۱۱۴۴ء) نے اس کی تشریح یوں کی ہے: "ایک شخص کا بطانہ اور ولیجہ وہ ہے جو اس کا مخصوص دوست اور چیدہ ساتھی ہو، جس پر اعتماد کر کے وہ اپنے اہم معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتا ہو" (الکشاف، ج ۱، ص ۱۶۲، المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۳ھ)۔

[2] اصل میں لفظ ولیجہ استعمال ہوا ہے جس کی ایک تشریح حاشیہ نمبر ۱ میں گزر چکی ہے۔ دوسری تشریح الراغب الاصفہانی نے کی ہے کہ "ولیجہ ہر وہ شخص ہے جس کو انسان اپنا معتمد بنائے جبکہ وہ اس کے اپنے لوگوں میں سے نہ ہو۔ یہ عرب کے اس محاورے سے ماخوذ ہے کہ فُلَانٌ وَلِيجَةٌ فِي الْقَوْمِ، یعنی فلاں شخص اس قوم میں گھسا ہوا ہے درانحالیکہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔" (مفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۲۲ھ)۔

الظَّالِمِيْنَ - (۲ : ۱۲۴)	والا ہوں - ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے بھی ؟ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔[1]
اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ - (۳۸ : ۲۸)	کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان لوگوں کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں ؟ کیا ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح کر دیں ؟
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸ : ۲۸)	اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔
وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۶ : ۱۵۱-۱۵۲)	اور اطاعت نہ کرو ان حد سے گزر جانے والوں کی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

[1] مشہور حنفی فقیہ ابو بکر الجصاص (م ۳۷۰ھ - ۹۸۰ع) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ لغت میں امام سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی پیروی کی جائے، خواہ حق میں یا باطل میں، لیکن اس آیت میں امام سے مراد صرف وہ شخص ہے جو اتباع کا مستحق ہو اور جس کی پیروی لازم ہو۔ لہٰذا اس اعتبار سے امامت کے اعلیٰ مرتبے پر انبیاء ہیں، پھر راست رو خلفاء، پھر صالح علماء اور قاضی۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں "پس کوئی ظالم نہ تو نبی ہو سکتا ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی کا خلیفہ یا قاضی یا ایسا عہدیدار ہو جس کی بات کا ماننا امور دین میں لازم ہو . . . . . اس آیت کی دلالت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے اور وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا، اور اگر وہ اپنے آپ کو اس منصب پر مسلط کر دے تو لوگوں پر اس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں ہے" (احکام القرآن، ج ۱، ص ۷۹-۸۰، المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۷ھ)۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹ : ۱۳)	تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہیں۔

(ج) وہ ناداں اور جاہل نہ ہوں بلکہ ذی علم، دانا اور معاملہ فہم ہوں اور کاروبارِ خلافت کو چلانے کے لیے کافی ذہنی اور جسمانی اہلیت رکھتے ہوں:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (۴ : ۵)	اپنے اموال، جنہیں اللہ نے تمہارے لیے ذریعۂ قیام بنایا ہے، ناداں لوگوں کے حوالے نہ کرو۔
قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ (۲ : ۲۴۷)	(بنی اسرائیل نے کہا) اس کو (یعنی طالوت کو) ہم پر حکومت کا حق کہاں سے حاصل ہوگیا، حالانکہ ہم اس کی بہ نسبت بادشاہی کے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال میں کوئی کشادگی نہیں دی گئی ہے۔ نبی نے کہا اللہ نے اسے تمہارے مقابلہ میں برگزیدہ کیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸ : ۲۰)	اور داؤد کی بادشاہی کو ہم نے مضبوط کیا اور اسے حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی
قَالَ اجْعَلْنِىْ عَلٰى خَزَاۗئِنِ الْاَرْضِ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (۱۲ : ۵۵)	یوسفؑ نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کردے، میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔
وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴ : ۸۳)	اور اگر یہ لوگ (افواہیں اڑانے کے بجائے) اس خبر کو رسول تک اور ان لوگوں تک پہنچاتے جو ان میں سے اولی الامر ہیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آجاتی جو ان کے درمیان بات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۳۹ : ۹)
کہو، کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے برابر ہو سکتے ہیں؟

(د) وہ ایسے امانت دار ہوں کہ ذمہ داریوں کا بوجھ ان پر اعتماد کے ساتھ رکھا جا سکے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (۴ : ۵۸)
اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے حوالے کرو۔[1]

۱۲۔ دستور کے بنیادی اصول اس ریاست کا دستور جن بنیادی اصولوں پر قائم ہوگا وہ یہ ہیں:

(الف) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۴ : ۵۹)
اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ آیت چھ دستوری نکات واضح کرتی ہے (۱) اللہ اور رسول کی اطاعت کا ہر اطاعت پر مقدم ہونا، (۲) اولی الامر کی اطاعت کا اللہ اور رسول کی اطاعت کے تحت ہونا، (۳) یہ کہ اولی الامر اہلِ ایمان میں سے ہوں (۴) یہ کہ لوگوں کو حکام اور حکومت سے نزاع کا حق ہے، (۵) یہ کہ نزاع کی صورت میں آخری فیصلہ کُن سند خدا اور رسول کا قانون ہے، (۶) یہ کہ نظامِ خلافت میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو اولی الامر اور عوام کے دباؤ سے آزاد رہ کر اُس بالاتر قانون کے مطابق جملہ نزاعات کا فیصلہ دے سکے۔

(ب) منتظمہ کے اختیارات لازماً حدود اللہ سے محدود اور خدا اور رسول کے قانون سے

---

[1] اس میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ذمہ داریوں کے مناصب ان لوگوں کے حوالہ کیے جائیں جو ان کے مستحق ہوں" (آلوسی۔ روح المعانی۔ ج ۵ ص ۵۸۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۵ھ)

محصور رہوں گے جس سے تجاوز کر کے وہ نہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کر سکتی ہے نہ کوئی ایسا حکم دے سکتی ہے جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو۔ کیونکہ اس آئینی دائرے سے باہر جا کر اسے اطاعت کے مطالبہ کا حق ہی نہیں پہنچتا (اس کے متعلق قرآن کے واضح احکام ہم اوپر پیراگراف نمبر ۲، ۵ اور ۹ میں نقل کر چکے ہیں)۔ علاوہ بریں یہ انتظامیہ لازماً شوریٰ، یعنی انتخاب کے ذریعہ سے وجود میں آنی چاہیے اور اسے شوریٰ، یعنی باہمی مشاورت کے ساتھ کام کرنا چاہیے جیسا کہ پیراگراف نمبر ۱ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن انتخاب اور مشاورت، دونوں کے متعلق قرآن قطعی اور متعین صورتیں مقرر نہیں کرتا بلکہ ایک وسیع اصول قائم کر کے اس پر عملدرآمد کی صورتوں کو مختلف زمانوں میں معاشرے کے حالات اور ضروریات کے مطابق طے کرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

(ج) مقننہ لازماً ایک شوروی ہیئت (CONSULTATIVE BODY) ہونی چاہیے (ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر ۱) لیکن اس کے اختیاراتِ قانون سازی بہرحال ان حدود سے محدود ہوں گے جو پیراگراف نمبر ۳ و ۵ میں بیان کیے گئے ہیں۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن میں خدا اور رسول نے واضح احکام دیئے ہیں یا حدود اور اصول مقرر کیے ہیں، یہ مقننہ ان کی تعبیر و تشریح کر سکتی ہے، ان پر عملدرآمد کے لیے ضمنی قواعد اور ضابطۂ کارروائی تجویز کر سکتی ہے مگر ان میں ردّوبدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ امور جن کے لیے بالاتر قانون ساز نے کوئی قطعی احکام نہیں دیئے ہیں، نہ حدود اور اصول متعین کیے ہیں، ان میں اسلام کی اسپرٹ اور اور اس کے اصولِ عامہ کے مطابق مقننہ ہر ضرورت کے لیے قانون سازی کر سکتی ہے، کیونکہ ان کے بارے میں کوئی حکم نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان کو اہلِ ایمان کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

(د) عدلیہ ہر طرح کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد ہونی چاہیئے تاکہ وہ عوام اور حکام سب کے مقابلہ میں قانون کے مطابق بے لاگ فیصلہ دے سکے۔ اسے لازماً ان حدود کا پابند

رہنا ہوگا جو پیراگراف ۳ و ۵ میں بیان ہوئے ہیں۔ اور اس کا فرض ہوگا کہ اپنی اور دوسروں کی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر ٹھیک ٹھیک حق اور انصاف کے مطابق معاملات کے فیصلے کرے۔

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (۵: ۴۸)	ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ۔ (۳۸: ۲۶)	اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ خدا کے راستے سے تجھے بھٹکا لے جائے۔
وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (۴: ۵۸)	اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

۱۳۔ ریاست کا مقصد اس ریاست کو دو بڑے مقاصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور ختم ہو جائے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (۵۷: ۲۵)	ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان[a] نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا نازل کیا[b] جس میں سخت قوت اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔

دوسرے یہ کہ حکومت کی طاقت اور وسائل سے بھلائی اور نیکی کو ترقی دی جائے اور برائی کو دبایا جائے:

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (۲۲: ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

[a][b] حاشیہ بر صفحہ ۲۲۰

۱۴۔ بنیادی حقوق اس نظام میں رہنے والے مسلم و غیر مسلم باشندوں کے بنیادی حقوق یہ ہیں جنہیں تعدی سے محفوظ رکھنا ریاست کا فرض ہے:

(الف) جان کا تحفظ۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۱۷: ۳۳)

کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے حق کے بغیر قتل نہ کرو۔

(ب) حقوقِ ملکیت کا تحفظ۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (۲: ۱۸۸-۴: ۲۹)

اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔

(ج) عزت کا تحفظ۔

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ . . . وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ . . . وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (۴۹: ۱۱-۱۲)

کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے . . . اور نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، نہ ایک دوسرے کو برے لقب دو . . . نہ تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اسکی بدی کرے

(د) نجی زندگی ( ) کا تحفظ۔

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (۲۴: ۲۷)

اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹: ۱۲)

اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو۔

(حاشیہ صفحہ سابق)

لہ میزان سے مراد عدل ہے جیسا کہ مجاہد اور قتادہ وغیرہ مفسرین نے کہا ہے (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۴، ص ۳۱۴، مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۳۷)

ﷺ۔ لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے" اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اگر لوگ تمرد اختیار کریں تو ان کے خلاف تلوار کی طاقت استعمال کرنی چاہیے" (الرازی، مفاتیح الغیب ج ۸، ص ۱۰۱، المطبعۃ الشرفیہ مصر، ۱۳۲۴ھ)

(ھ) ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق،

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴: ۱۴۸)

اللہ برائی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا الا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو۔

(و) امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق جس میں تنقید کی آزادی کا حق بھی شامل ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۵: ۷۸-۷۹)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ زیادتیاں کرتے تھے، وہ ایک دوسرے کو برے کاموں کے ارتکاب سے روکتے نہ تھے، بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔

اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۷: ۱۶۵)

ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو برائی سے روکتے تھے اور پکڑ لیا ظالموں کو عذاب سخت میں اس فسق کے بدلے جو وہ کرتے تھے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳: ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لیے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(ز) آزادی اجتماع (FREEDOM OF ASSOCIATION) کا حق، بشرطیکہ وہ نیکی اور بھلائی کے لیے استعمال ہو اور اسے معاشرے میں تفرقے اور بنیادی اختلافات برپا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

اور ہونا چاہیے تم میں سے ایک ایسا گروہ جو دعوت دے بھلائی کی طرف اور حکم دے نیکی کا

عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۳ : ۱۰۴-۱۰۵)	اور روکے بدی سے۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو منفرق ہو گئے اور جنہوں نے اختلاف کیا جبکہ ان کے پاس واضح ہدایات آچکی تھیں۔ ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔

(ح) ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق،

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲ : ۲۵۶)	دین میں جبر نہیں ہے۔
اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (۱۰ : ۹۹)	کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲ : ۱۹۱)	فتنہ[1] قتل سے شدید تر چیز ہے۔

(ط) مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق،

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۶ : ۱۰۸)	یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔

اس معاملہ میں قرآن یہ صراحت کرتا ہے کہ مذہبی اختلافات میں علمی بحث تو کی جا سکتی ہے مگر وہ احسن طریقہ سے ہونی چاہیئے،

لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۲۹ : ۴۶)	اہل کتاب کے ساتھ بحث نہ کرو مگر احسن (FAIR) طریقہ سے۔

(ی) یہ حق کہ ہر شخص صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہو اور دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری میں اسے نہ پکڑا جائے،

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا	ہر متنفس جو کماتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے اور

[1] فتنہ سے مراد کسی شخص پر تشدد کر کے اسے اپنا دین بدلنے پر مجبور کرنا۔ (ابن جریر۔ ج ۲، ص ۱۱۱)

تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰی (۶ : ۱۶۴ - ۱۷ : ۱۵ - ۳۵ : ۱۸ - ۳۹ : ۷ - ۵۳ : ۳۸)	کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا[۱]

(ک) یہ حق کہ کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی ثبوت کے بغیر اور انصاف کے معروف تقاضے پورے کیے بغیر نہ کی جائے،

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔ (۴۹ : ۶)	اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو بے جانے بوجھے نقصان پہنچا دو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷ : ۳۶)	کسی ایسی بات کے پیچھے نہ لگ جاؤ جس کا تمہیں علم نہ ہو۔
وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (۴ : ۵۸)	اور جب لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

(ل) یہ حق کہ حاجت مند اور محروم افراد کو ان کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی فراہم کی جائیں

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱ : ۱۹)	اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کا اور محروم کا۔

(م) یہ حق کہ ریاست اپنی رعایا میں تفریق اور امتیاز نہ کرے بلکہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ... اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۴)	فرعون نے زمین میں سر اٹھایا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جن میں سے ایک گروہ کو وہ کمزور بنا کر رکھتا تھا ... یقیناً وہ مفسد لوگوں میں تھا۔

۱۵ - باشندوں پر حکومت کے حقوق اس نظام میں باشندوں پر حکومت کے حقوق یہ ہیں:

[۱] یعنی ہر قصوروار آدمی جس قصور کا ارتکاب بھی کرتا ہے اس کا وہ خود ذمہ دار ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا ماخوذ نہ ہوگا۔ اور کسی شخص پر اس کے اپنے قصور کے سوا دوسرے کے قصور کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔" ابن جریر ج ۸، ص ۹۳۔

(الف) وہ اس کی اطاعت کریں،

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴ : ۵۹)	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔

(ب) وہ قانون کے پابند ہوں اور نظم میں خلل نہ ڈالیں،

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷ : ۸۵)	زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد۔
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا ... (۵ : ۳۳)	جو لوگ اللہ اور رسول سے جنگ کرتے ہیں[1] اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا صلیب دیئے جائیں ...

(ج) وہ اس کے تمام بھلے کاموں میں تعاون کریں،

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵ : ۲)	نیکی اور پرہیزگاری میں تعاون کرو۔

(د) وہ دفاع کے کام میں جان اور مال سے اس کی پوری مدد کریں،

مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ... اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ... اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹ : ۳۸-۴۱)	تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین پر جم کر بیٹھ جاتے ہو ... اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دیگا اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے ... نکلو، خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

---

[1] فقہاء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو رہزنی اور ڈاکہ زنی کریں یا مسلح ہو کر ملک میں بدامنی پھیلائیں (الجصاص، ج ۲، ص ۴۹۳)

۱۶۔ خارجی سیاست کے اصول | اسلامی ریاست کی خارجی پالیسی کے متعلق جو اہم ہدایات قرآن میں دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

(الف) عہد و پیمان کا احترام، اور اگر معاہدہ ختم کرنا ناگزیر ہو تو اس سے دوسرے فریق کو خبردار کر دینا،

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷: ۳۴)

عہد وفا کرو، یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہو گی۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا .... وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶: ۹۱-۹۲)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم معاہدہ کرو اور قسمیں پختہ کر لینے کے بعد ان کو نہ توڑو ... اور نہ ہو جاؤ اس عورت کی طرح جس نے اپنا ہی محنت سے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ فائدہ حاصل کرے۔ اللہ اس چیز کے ذریعہ سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور ضرور وہ قیامت کے روز تمہارے اختلافات کی حقیقت کھول دیگا۔

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۹: ۷)

جب تک دوسرے فریق کے لوگ تمہارے ساتھ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو یقیناً اللہ پرہیز گاروں کو پسند کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ (۹: ۴)

مشرکین میں سے جن لوگوں کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ وفا کرنے میں کوئی کمی نہ کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے عہد کو معاہدے کی مدت تک پورا کرو

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ (۸: ۷۲)	اور اگر (دشمن کے علاقے میں رہنے والے مسلمان) تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تمہارا فرض ہے، مگر یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں دی جا سکتی جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔
وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔ (۸: ۵۸)	اور اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (بدعہدی) کا اندیشہ ہو جائے تو ان کی طرف پھینک دو (ان کا عہد) برابری ملحوظ رکھ کر[1] یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

(ب) معاملات میں دیانت و راستبازی،

وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ (۱۶: ۹۴)	اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و فریب کا ذریعہ نہ بنالو[2]

(ج) بین الاقوامی عدل۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵: ۸)	اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہی خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

(د) جنگ میں غیر جانبدار ممالک کے حدود کا احترام،

---

[1] یعنی تمہارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ یا صلحنامہ ہوا تھا اس کے فسخ ہو جانے کی اطلاع انہیں دے دو تاکہ فریقین اس کے فسخ ہونے کے علم میں برابر ہو جائیں، اور اگر تم ان کے خلاف کوئی کارروائی کرو تو فریق ثانی اس خیال میں نہ رہے کہ تم نے اس سے بدعہدی کی ہے۔" (الجصاص ج ۳، ص ۸۳)۔

[2] یعنی دھوکا دینے کی نیت سے معاہدہ نہ کرو کہ فریق ثانی تو تمہاری قسموں کی بنا پر تمہاری طرف سے مطمئن ہو جائے اور تمہارا ارادہ یہ ہو کہ موقع پا کر اس سے غدر کرو گے" (ابن جریر ج ۱۴، ص ۱۱۲)۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ ۔ ۔ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۴ : ۹۰)	اور اگر وہ (یعنی دشمنوں سے ملے ہوئے منافق مسلمان) نہ مانیں تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں پاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو

(ھ) صلح پسندی ،

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸ : ۶۱)	اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ ۔

(و) فساد فی الارض اور زمین میں اپنی برائی قائم کرنے کی کوششوں سے اجتناب ،

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸ : ۸۳)	وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی برتری نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں ۔ نیک انجام پرہیزگار لوگوں کے لئے ہے ۔

(ز) غیر معاند طاقتوں سے دوستانہ برتاؤ ،

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۶۰ : ۸)	اللہ تم کو اس بات سے نہیں روکتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے ان کے ساتھ تم نیک سلوک اور انصاف کرو ۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔

(ح) نیک معاملہ کرنے والوں سے نیک برتاؤ ،

هَلْ جَزَاۗءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵ : ۶۰)	کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہے ؟

(ط) زیادتی کرنے والوں کے ساتھ اتنی ہی زیادتی جتنی انہوں نے کی ہو،

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (۲ : ۱۹۴)	پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر بس اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی تھی اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ پرہیزگار لوگوں کے ساتھ ہے
وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (۱۶ : ۱۲۶)	اور اگر بدلہ لو تو اتنا ہی لو جتنا تمہیں ستایا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو وہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے۔
وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴۲ : ۴۰ - ۴۲)	اور برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جتنی کی گئی ہو۔ پھر جو معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور وہ لوگ قابلِ گرفت نہیں ہیں جن پر ظلم کیا گیا ہو اور اس کے بعد وہ اس کا بدلہ لیں۔ قابلِ گرفت تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات قرآن کے ان ۶۰ نکات میں جس ریاست کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) ایک آزاد قوم کی طرف سے بہ شعوری عہد اس ریاست کو وجود میں لاتا ہے کہ وہ پوری خود مختاری کی مالک ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے خود رب العٰلمین کے آگے سر تسلیم خم کر دے گی، اور اس کے ماتحت حاکمیت کے بجائے خلافت کی حیثیت قبول کر کے ان ہدایات و احکام کے مطابق کام کرے گی جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے عطا کیے ہیں۔

(۲) وہ حاکمیت کو خدا کے لیے خالص کرنے کی حد تک تھیاکریسی کے بنیادی نظریہ سے متفق ہے۔ مگر اس نظریے پر عملدرآمد کرنے میں اُس کا راستہ تھیاکریسی سے الگ ہو جاتا ہے۔ مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت کا حامل ٹھیرانے اور حل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے حوالے کر دینے کے بجائے وہ حدودِ ریاست میں رہنے والے تمام اہلِ ایمان کو (جنہوں نے رب العٰلمین کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا شعوری عہد کیا ہے) خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل و عقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان کے حوالے کرتی ہے۔

(۳) وہ جمہوریت کے اس اصول میں ڈیموکریسی سے متفق ہے کہ حکومت کا بننا اور بدلنا اور چلایا جانا بالکل عوام کی رائے سے ہونا چاہیے۔ لیکن اس میں عوام مطلق العنان نہیں ہوتے کہ ریاست کا قانون، اس کے اصولِ حیات، اس کی داخلی و خارجی سیاست، اور اس کے وسائل و ذرائع، سب اُن کی خواہشات کے تابع ہوں، اور جدھر جدھر وہ مائل ہوں یہ ساری چیزیں بھی اسی طرف مڑ جائیں، بلکہ اُس میں خدا اور رسُول کا بالاتر قانون اپنے اصول و حدود اور اخلاقی احکام و ہدایات سے عوام کی خواہشات پر ضبط قائم رکھتا ہے، اور ریاست ایک ایسے متعین راستے پر چلتی ہے جسے بدل دینے کے اختیارات نہ اس کی منتظمہ کو حاصل ہوتے ہیں، نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو، اِلّا یہ کہ قوم خود اپنے عہد کو توڑ دینے کا فیصلہ کر کے دائرۂ ایمان سے نکل جائے۔

(۴) وہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کو چلانا فطرۃً انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو اس کے بنیادی نظریے اور اصول کو تسلیم کرتے ہوں، لیکن تسلیم نہ کرنے والے جتنے لوگ بھی اس کے حدود میں تابعِ قانون ہو کر رہنا قبول کر لیں انہیں وہ تمام مدنی حقوق اُسی طرح دیتی ہے جس طرح تسلیم کرنے والوں کو دیتی ہے

(۵) وہ ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے

صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زمین کے ہر گوشے میں نسلِ انسانی کے جو افراد بھی چاہیں ان اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز و تعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس نظام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی خالص اصولی ریاست کے لیے ایک عالمی ریاست بن جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن اگر زمین کے مختلف حصوں میں بہت سی ریاستیں بھی اس نوعیت کی ہوں تو وہ سب کی سب یکساں اسلامی ریاستیں ہوں گی، کسی قوم پرستانہ کشمکش کے بجائے ان کے درمیان پورا پورا برادرانہ تعاون ممکن ہوگا اور کسی وقت بھی وہ متفق ہو کر اپنا ایک عالمگیر وفاق قائم کر سکیں گی۔

(۶) سیاست کو مفاد اور اغراض کے بجائے اخلاق کے تابع کرنا، اور اسے خدا ترسی و پرہیزگاری کے ساتھ چلانا اس ریاست کی اصل رُوح ہے۔ اس میں فضیلت کی بنیاد صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ اس کے کارفرماؤں اور اہلِ حل و عقد کے انتخاب میں بھی ذہنی و جسمانی صلاحیت کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اس کے داخلی نظام کا بھی ہر شعبہ دیانت و امانت اور بے لاگ عدل و انصاف پر چلنا چاہیے۔ اور اس کی خارجی سیاست کو بھی پوری راستبازی، قول و قرار کی پابندی، امن پسندی، اور بین الاقوامی عدل اور حسنِ سلوک پر قائم ہونا چاہیے۔

(۷) یہ ریاست محض پولیس کے فرائض انجام دینے کے لیے نہیں ہے کہ اس کا کام صرف نظم و ضبط قائم کرنا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو، بلکہ یہ ایک مقصدی ریاست ہے جسے ایجابی طور پر اجتماعی عدل اور بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کے لیے کام کرنا چاہیے۔

(۸) حقوق اور مرتبے اور مواقع میں مساوات، قانون کی فرمانروائی، نیکی میں تعاون اور بدی میں عدمِ تعاون، خدا کے سامنے ذمہ داری کا احساس، حق سے بڑھ کر فرض کا شعور، افراد اور معاشرے اور ریاست سب کا ایک مقصد پر متفق ہونا، اور معاشرے میں کسی شخص کو

ناگزیر لوازمِ حیات سے محروم نہ رہنے دینا، یہ اس ریاست کی بنیادی قدریں ہیں۔

(۹) فرد اور ریاست کے درمیان اس نظام میں ایسا توازن قائم کیا گیا ہے کہ نہ ریاست مختارِ مطلق اور ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن کر فرد کو اپنا بے بس مملوک بنا سکتی ہے، اور نہ فرد بے قید آزادی پا کر خود سر اور اجتماعی مفاد کا دشمن بن سکتا ہے۔ اس میں ایک طرف افراد کو بنیادی حقوق دے کر اور حکومت کو بالاتر قانون اور شوریٰ کا پابند بنا کر انفرادی شخصیت کے لیے نشوونما کے پورے مواقع فراہم کیے گئے ہیں اور اقتدار کی بے جا مداخلت سے اس کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ مگر دوسری طرف فرد کو بھی ضابطۂ اخلاق میں کسا گیا ہے اور اس پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق کام کرنے والی حکومت کی دل سے اطاعت کرے، بھلائی میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کرے، اس کے نظام میں خلل ڈالنے سے باز رہے، اور اس کی حفاظت کے لیے جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔

فہرست مآخذ

۱۔ قرآن حکیم۔ آیات کے حوالوں میں پہلا عدد سورتوں کا نمبر ہے اور دوسرا عدد آیات کا نمبر۔

۲۔ ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، المطبعۃ الامیریہ، مصر، ۱۳۲۸ھ

۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مطبعہ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۴۷ء

۴۔ آلوسی، روح المعانی، ادارہ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۵ھ

۵۔ الجصّاص، احکام القرآن، المطبعۃ البہیّہ، مصر، ۱۳۴۷ھ

۶۔ الرازی، مفاتیح الغیب، المطبعۃ الشرفیہ، مصر، ۱۳۲۴ھ

۷۔ الراغب الاصفہانی، مفردات فی غریب القرآن، المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۲۲ھ

۸۔ الزمخشری، الکشاف، المطبعۃ البہیّہ، مصر، ۱۳۴۳ھ

تصحیح

ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعت میں ایک مضمون "معرکۂ حق و باطل" شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں قرآن مجید کی جو آیات حوالے کے طور پر درج کی گئی تھیں، ان میں متعدد اغلاط رہ گئی ہیں۔ ہم اس فروگذاشت پر ندامت کے ساتھ ذیل میں ان اغلاط کی تصحیح کر رہے ہیں

ادارہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۹	۱۳	فَمَنْ تَبِعَ	فَمَنِ اتَّبَعَ	۱۲۳	۸	يَرىٰ	يُرىٰ
۱۲۲	۱۸	يوحىٰ	يُوحِيْ	۱۲۳	۸	يُجْزىٰ بِهٖ	يُجْزَا بِه
۱۲۴	۱۵	الْمَلَاءْ	الْمَلَاُ	۱۳۶	۱۱	اَتْرَفُوْا	اُتْرِفُوْا
۱۲۴	۱۷	لَنُغْنِيَكَ	لَنَظُنُّكَ	۱۳۹	۲	يُفْتِنُونَ	يُفْتَنُوْنَ
۱۲۴	۲۱	اُخْرِجوهم	اَخْرِجُوْهُمْ	۱۳۹	۳	فَلْيَعْلَمَنَّ الله	فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ
۱۲۵	۵	الْمَلَاءُ	الْمَلَاُ	۱۳۹	۴	وليَعْلَمُنَّ	وَلَيَعْلَمَنَّ
۱۲۵	۶	قَومِهٖ ... لنخرِ	قومه لَنُخْرِجَنَّكَ	۱۳۹	۹	يُمَيِّزَ الْخَبِيثُ	يَمِيزَ الْخَبِيْثَ
۱۲۵	۷	مَعَكَ ... مِن	معك من	۱۴۰	۱۳ و ۱۴	وَرَسُوْلُهٗ وَزَادَهُمْ اِيمَانًا وَتَسْلِيمًا	وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا
۱۲۹	۱۵	وَلَاَصَلِّبَنَّكُمْ	وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ	۱۴۱	۱	(الصّٰفّٰت ۱۲۳)	(الصّف ۱۱۳)
۱۲۹	۱۹	اَلْحَيٰوةِ	اَلْحَيٰوةَ				
۱۲۳	۸	اِنَّ	اَنَّ				

مُنکرینِ حدیث کے مغالطے

ملک غلام علی صاحب

اللہ کے آخری نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اپنی پوری تاریخ میں گزشتہ صدی تک دو فتنوں سے محفوظ رہی ہے۔ اوّلاً اس امت کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی مدّعیٔ نبوت کو اطمینان کے ساتھ اپنی جھوٹی نبوّت کے پرچار کے مواقع حاصل ہوئے ہوں اور اس کے نتیجے میں ایک مستقل جماعت وجود میں آگئی ہو جو بلا روک ٹوک تبلیغ و تلقین اور توالد و تناسل کے ذریعے سے اسی امت کی گود میں پلتی رہی ہو۔ ثانیاً اس امت نے اپنے اندر کسی ایسے گروہ کو پنپنے اور پروان چڑھنے کے مواقع عطا نہیں کیے جو اس موقف کو اختیار کرے کہ قرآن کے سوا کوئی دوسرا مآخذ دینی احکام و قوانین کا ایسا نہیں ہے جس کی پابندی مسلمان پر لازم ہو اور جس سے سرتابی کی گنجائش نہ ہو۔ بلاشبہ امتِ مسلمہ کے اندر متعدد جھوٹے نبی نمودار ہوئے لیکن ان میں سے ہر ایک کی دعوت کا اوّلین فرصت میں اس طرح قلع قمع کر دیا گیا کہ تاریخ کے صفحات میں وہ بس افسانۂ عبرت بن کر رہ گئی۔ اسی طرح ایک آدھ گروہ نے قول و فعلِ رسول کو حجت شرعی ماننے سے گریز کی کوشش کی، بالخصوص ایسی احادیث کو نشانۂ اعتراض بنایا جن سے ان کے مخصوص گمراہانہ سیاسی و کلامی نظریات پر زد پڑتی تھی، لیکن امت کی اکثریت کو ان لوگوں سے اعلان براءت کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی اور اس کے بعد ملّتِ اسلامیہ صدہا برس تک ایسے لوگوں کے وجود سے پاک رہی۔ درحقیقت اللہ نے امتِ محمدیہ کے سینے میں اپنے نبی کی ذات سے ایسی بے مثال محبت و والہیت پیدا کر دی ہے کہ اس کے اجتماعی ضمیر نے ہمیشہ اس طرح کے افراد کی ضلالت آمیز بے راہرویوں اور موشگافیوں کو قبولِ عام اور بقائے دوام عطا

کرنے سے انکار کیا ہے اور اس کے نام لیواؤں نے اپنے ہادی و رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر نقشِ پا کو اپنے سفرِ حیات میں نشانِ راہ بنائے رکھا ہے۔

لیکن ہماری شامتِ اعمال کا کرشمہ ہے کہ گزشتہ صدی میں ادعائے نبوت اور انکارِ سنت دونوں فتنے بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں جنم لے چکے ہیں اور اب یہ ہمارے درمیان پھل پھول رہے ہیں اور برگ و بار لا رہے ہیں۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو موخر الذکر فتنہ مقدم الذکر کی بہ نسبت زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے گروہ کی دعوت محض ایک شخصیت اور اس کے ایسے دعاوی کی جانب ہے جو ایک عام مسلمان کے لیے زیادہ دلفریب اور پرکشش نہیں ہیں اور جن کی ضلالت بہت بڑی حد تک واضح ہے لیکن دوسرے گروہ کی دعوت بادی النظر میں بڑی معصوم اور جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہے۔ ان کی پکار بظاہر کتاب اللہ اور صرف کتاب اللہ کی طرف ہے، اس لیے ایک مسلمان ان کے دامِ تزویر میں بآسانی گرفتار ہو سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اُسے محسوس ہو کہ اس گروہ کا اصل مقصود کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو آپس میں ٹکرانا ہے اور بالآخر خود قرآن کو اس کے لانے والے کی قولی و عملی تشریح سے الگ کر کے اپنی خود ساختہ تاویلات کا کھلونا بنانا ہے

فتنۂ انکارِ حدیث کے علمبرداروں کو چونکہ رسول اور اسوۂ رسول سے امت کی وارفتگی اور شیفتگی کا اچھی طرح علم ہے، اس لیے حدیث و سنت کا احترام دلوں سے محو کرنے اور اس کے خلاف عامۃ المسلمین میں استحقار و استخفاف کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ان حضرات نے حدیث کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات گھڑنے اور شبہات و وساوس پھیلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر قابلِ اعتناء اعتراضات ایسے ہیں جن کا شافی جواب اہلِ علم دے چکے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو معترضین مختلف پیرایوں میں بار بار دُہرا رہے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان کا جواب بھی مختلف انداز میں بار بار دیا جاتا رہے اور اُن کے منطقی مغالطوں کے ہر پہلو کو واضح کیا جاتا رہے تاکہ ان کی حقیقت و

ماہیت سے مسلمان پوری طرح باخبر ہوں اور وہ سوچے سمجھے بغیر ایسے فتنوں کا شکار نہ ہو جایا کریں اسی خیال کے پیشِ نظر یہاں ان حضرات کے چند بنیادی اعتراضات نقل کر کے ان کا مختصر جواب پیش کیا جا رہا ہے ۔

مَیں اس وقت منکرینِ حدیث کے تین بڑے اعتراضات کو لیتا ہوں جنہیں وہ بڑے شد و مد اور تکرار سے پیش کرتے ہیں ۔ ان میں سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر حدیث کا دین میں کوئی مقام ہوتا اور دینی معاملات میں اسے ایک دائمی اور بالاتر سند اور حجت کی حیثیت حاصل ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُسی اہتمام سے ہر حدیث کو لکھوا لیا کرتے، جس اہتمام سے آپ قرآن کی ہر آیت کو لکھوا لیتے تھے ۔ جس شے کو قلمبند کرا کے دوسروں تک پہنچانے کا باقاعدہ التزام نہیں کیا گیا، اُسے ہمیشہ کے لیے ایک واجب الاتباع قانون کا درجہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے ؟

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر حدیث بھی قرآن کی طرح مأخذِ دین ہے تو پھر حدیث کا کوئی ایسا کامل اور جامع دفتر موجود ہونا چاہیے جو پورے ذخیرۂ حدیث پر حاوی ہو اور جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ کوئی حدیث اس میں شامل ہونے سے نہیں رہ گئی ہے ، ورنہ ماخذِ دین کے غیر مکمل اور نا تمام ہونے کی صورت میں دین و ایمان کا ناقص و نا تمام ہونا لازم آتا ہے ۔

تیسرا اعتراض ان حضرات کا یہ ہے کہ حدیث کے مجموعے جو ہمارے ہاں متداول ہیں ان کی بہت سی احادیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا معاملہ مختلف فیہ ہے بعض احادیث ضعیف اور بعض موضوع ہیں ۔ حالانکہ قرآن کے بارے میں اس طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کی کوئی آیت ضعیف یا موضوع نہیں کہی جا سکتی ۔ اس لحاظ سے گویا حدیث کا مواد صرف غیر مکمل ہی نہیں بلکہ تحریف سے بھی پاک نہیں ہے ، حالانکہ جو شے مأخذِ ہدایت اور حجتِ دین ہو، اس کا خالص اور بے آمیز ہونا ضروری ہے ۔

اِن اعتراضات کی بنیاد پر منکرینِ حدیث یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشیتِ ایزدی چونکہ اس امر کی متقضی تھی کہ قرآن ہی دین کے معاملے میں حجت و سند ہو، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسے اپنی نگرانی میں مکمل طور پر لکھوا لیا اور اللہ نے اسے ہر طرح کی تنقیص و تحریف سے پاک رکھا۔ بخلاف اس کے حدیث کو ماخذ دین بنانا چونکہ مصلحتِ ربانی کا تقاضا نہ تھا، اس لیے اللہ اور اس کے رسول نے اس کی محافظت کا کوئی خاص اہتمام نہ فرمایا۔

یہ سارے اعتراضات جو اوپر گنوائے گئے ہیں، چند در چند مغالطہ آفرینیوں و ابلہ فریبیوں کا مجموعہ ہیں، جن کی حقیقت تأمل و تجزیہ کے بعد بآسانی واضح ہو سکتی ہے۔ ان میں سے پہلے اعتراض کی وساطت سے مخاطب کو جس غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں جس طرح حکمران اور قانون ساز بالعموم اس امر کے عادی اور مکلف ہیں کہ وہ اپنے احکام و قوانین کو لکھ کر یا چھاپ کر شائع کریں، اسی طرح شاید اللہ اور اس کے انبیاء بھی اس تکلف کے محتاج ہیں کہ وہ اپنے احکام کو مستند اور قابلِ نفاذ بنانے کے لیے انہیں باقاعدہ ضابطۂ تحریر میں لائیں، بالخصوص جن احکام کو نسلاً بعد نسلٍ واجب الاتباع بنانا مطلوب ہو انہیں تو ضرور ہی ایک گزٹ میں درج کیا جانا چاہیے ورنہ دنیا میں ان کا اعتبار کیسے قائم ہو سکے گا۔

یہ خیال اور نظریہ ہر حیثیت سے باطل، لغو اور مہمل ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ نسلِ انسانی کو زمین میں پیدا کرنے کے بعد اُسے سب سے پہلے لکھنا سکھاتا اور پھر ہر نبی پر یا تو لکھے لکھائے احکام و ہدایات نازل فرماتا یا کم از کم ان پر لازم کر دیتا کہ وہ نزولِ وحی کے بعد فوراً اسے قیدِ تحریر میں لے آیا کریں۔ لیکن خالقِ کائنات کی جانب سے اس طرح کے ازلی انتظام کیے جانے کا کوئی عقلی یا نقلی ثبوت موجود نہیں ہے۔ قرآن مجید اس امر کی کہیں صراحت نہیں کرتا کہ ہر نبی اور اس کی امت کے لوگ ہمیشہ سے فنِ کتابت سے آشنا تھے، ہر منزل من اللہ ہدایت کو لکھ کر محفوظ کر لیتے تھے اور اسی شکل میں دوسروں تک منتقل کیا کرتے تھے۔ قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کے کسی نبی کی کتاب یا صحیفے کا ذکر نہیں ملتا اور حضرت ابراہیم کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح یا اس سے کچھ زاید شمار کیا جاتا ہے۔ قرآن کے علاوہ دوسری شے جو منکرینِ حدیث کے نزدیک قابلِ استناد ہو سکتی ہے وہ تاریخی آثار و

اکتشافات ہیں۔ ان سے بھی اس امر کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ انسان ابتدائے آفرینش ہی سے نوشت وخواند پر قادر ہو گیا تھا۔ اب تک کی اثری تحقیقات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حروفِ تہجی سے ملتی جلتی علامات کے ذریعے سے مطالب و معانی کے اظہار کا بالکل ابتدائی طریقہ بھی چار ہزار سال پہلے کے انسان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وحی الٰہی کے تحفظ و استناد کا ناگزیر وسیلہ اس کی کتابت ہے، تو جب انسان اس فن سے آشنا ہی نہ تھا تو کیا اس وقت انبیاء اور ان کی امتوں کے پاس احکامِ الٰہی کے محفوظ رہنے اور دوسروں تک منتقل ہونے کی کوئی قابلِ اعتماد صورت ہی نہ تھی؟

پھر یہ بات بھی بالکل قرینِ قیاس ہے کہ ایک زمانے میں ایک قوم یا چند قومیں لکھنا پڑھنا سیکھ گئی ہوں اور تمدنی روابط کی دشواری کے باعث دوسری قومیں اس وقت تک یا اس کے مدتوں بعد تک اس سے عاری رہی ہوں۔ قرآن مجید اس کی تصریح کرتا ہے کہ ہر قوم میں ہادی اور ہر امت میں رسول بھیجے گئے۔ تو کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ دنیا کے ایک حصے میں جہاں لوگ لکھے پڑھے تھے اور جنہوں نے وحی ربانی کو تحریراً منضبط کر لیا، ان پر اور ان کی نسلوں پر تو حجت تمام ہو گئی، لیکن دنیا کے دوسرے حصے میں جہاں سارے لوگ اَن پڑھ تھے یا جہاں کے رسول اور ان کے اوّلین صحابہ امّی تھے اور وہ وحی کو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ کر سکے، ان قوموں اور ان کی آئندہ نسلوں پر رسول کی آمد کے باوجود اللہ کی جانب سے حجت قائم نہ ہو سکی؟

مسئلے کے اس پہلو پر غور کرنے کے بعد یہ تسلیم کر لینا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ حدیثِ رسول ہی نہیں، بلکہ کلام اللہ کے موجبِ حجت و استناد اور لائقِ اتباع ہونے کے لیے بھی اس کا مکتوب ہونا شرط لازم نہیں ہے۔ بلکہ رسول کی نگرانی میں ان کے لکھے یا نہ لکھے جانے کا انحصار عملی دقتوں یا سہولتوں پر اور ان تاریخی و تمدنی حالات پر ہے جن میں ایک نبی یا رسول مبعوث ہوتا ہے۔ اگر حالات ان دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کی کتابت کے حق میں موافق نہ ہوں تو عدمِ کتابت سے کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی جب تک وحی کے سفینوں میں محفوظ کرنے کا امکان نہ ہو، اللہ اسے

سینوں میں محفوظ کرنے کا انتظام کر دیتا ہے۔ آخر قرآن کی وحی بھی تحریری تو نہیں بلکہ زبانی ہی نازل ہوتی تھی اور فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازبر ہو جاتی تھی۔ پھر آنحضورؐ اسے یادہی سے املا کراتے تھے اور کتابت سے پہلے اور کتابت کے بعد وہ حافظے میں محفوظ رہتی تھی۔

اب دوسرے اعتراض کو لیجیے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ حدیث کا ذخیرہ نامکمل ہے، اس لیے اگر اسے دینی تعلیمات کا ماخذ قرار دیا جائے تو اس سے دین کی عدمِ تکمیل لازم آتی ہے۔ اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ حدیث و سنت کا موجودہ مدوّن ذخیرہ جس شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، کوئی صاحبِ علم و بصیرت اگر اس پورے ذخیرے کو جذبۂ عقیدت کے ساتھ نہ سہی، محض کھلے دل اور انصاف کی نظر سے مطالعہ کرے، تو وہ اس کے ناقص و ناتمام ہونے کی شکایت کرنے کے بجائے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ دنیا میں کسی تاریخی شخصیت کے حالات اور اقوال و افعال اتنی باریک بینی، جزرسی، جامعیت اور صحت کے ساتھ جمع اور مرتب نہیں کیے جا سکے ہیں اور نہ کیے جا سکتے ہیں۔ صحابہؓ کرام، تابعین اور محدثین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے سے متعلق اتنی وافر مقدار میں معلومات یکجا کر دی ہیں کہ انسان انھیں ناکافی سمجھنے کے بجائے اس بات پر حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ اتنا کثیر مواد کیونکر فراہم کیا گیا ہو گا۔ ان بزرگوں نے ایک ایک حدیث معلوم کرنے یا صرف اس کی تصدیق و توثیق کرنے کی غرض سے سینکڑوں میل کے سفر کیے ہیں، اپنی پوری عمریں اسی کام میں کھپا دی ہیں اور مرتے وقت بھی بعض ایسی روایات کو بیان کر دیا ہے، جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ شاید یہ پہلے بیان نہ کی جا سکی ہوں اور ان کو لوگوں تک پہنچائے بغیر دنیا سے رخصت ہو جانا موجبِ گناہ ہو۔ اس صورتِ حال میں مشکل ہی سے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ سنتِ نبویؐ کا کوئی جز ایسا بھی ہو گا جس کا احاطہ کتبِ حدیث میں نہیں کیا جا سکا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی قول یا عمل روایت ہونے سے رہ بھی گیا ہو تو اس سے بحیثیت مجموعی دین میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ اللہ کسی متنفس کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں کرتا اور اعمال کی بنا نیت

پر ہے۔ اگر ہم سنت کو ماخذِ دین سمجھنے کے باوجود اس کا کوئی حصہ قصداً ضائع یا نظر انداز کر دیں تو بلا شبہ یہ فعل ہمارے دین و ایمان کے منافی ہوگا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا عمل اگر اتفاقاً مروی ہونے سے رہ گیا ہو، تو اس سے ہمارے دین میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔ بشرطیکہ جو کچھ ہمارے پاس ہے، اس سے بھی ہم یہ فرضی بہانہ کر کے دستبردار نہ ہو جائیں کہ یہ نامکمل ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے مزید واضح کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، اس کا کوئی حصہ نہ تلف ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ لیکن کتبِ سابقہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ ان میں سے متعدد کتابیں یا ان کے بعض حصے گم ہو گئے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل اور ان کی کتبِ مقدسہ کی جو تاریخ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہ بھی صاف طور پر بتاتی ہے کہ بارہا کتبِ سماوی کے اجزا حاملینِ کتاب کی غفلت، کفار کی یلغار یا حوادثِ روزگار کے باعث صفحۂ ہستی سے بالکل محو ہو گئے۔

یہاں پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس یہی ادھوری تعلیمات رہ گئی تھیں اور اس آفت کے بعد جن امتوں میں کوئی نیا نبی نہیں آیا تھا جو نئی کتاب لائے یا وحی کے مطابق سابق کتاب کی تعلیمات کی تجدید و تکمیل کرے، ان امتوں کے ہدایت پانے کی آخر کیا سبیل تھی؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس زمانے کی دستبرد سے محفوظ جو کچھ بھی کتاب کا بقیہ (نصیباً من الکتاب) موجود تھا، وہ اسی کے اتباع پر مامور تھے اور یہی ان کے لیے ذریعۂ ہدایت و وسیلۂ نجات تھا۔ اگر انھوں نے اخلاص کے ساتھ اسی کی پیروی میں کوئی کوتاہی نہیں کی، تو ان کے دین و ایمان میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوئی۔

یہاں یہ امر مزید قابلِ ذکر ہے کہ قرآن سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں۔ ان کی تعلیمات صرف گم ہی نہیں ہوئیں، بلکہ ان میں تفسیر، حدیث، تاریخ، سیرت، اور فقہ وغیرہ کا جابجا اور وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ جس زبان میں وہ کتابیں نازل ہوئیں اور لکھی گئیں، اس کے نوشتے مٹ گئے اور بعض اوقات صرف ترجمہ اور ترجمہ در ترجمہ رہ گیا۔ اس طرح یہ کتابیں نہ صرف نامکمل بلکہ قطعاً محرف ہو کر رہ گئیں اور ان کے ماننے والوں کے پاس ان کی تصحیح کا کوئی ذریعہ بھی نہ رہا۔ تبھی

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عین قبل اہلِ کتاب جس توراۃ اور انجیل کی پیروی کر رہے تھے ان میں قرآن کے بیان اور اہلِ کتاب کے اپنے اعتراف کے بموجب ایسی ہی مایوس کن حد تک تحریف کی جا چکی تھی، حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ کے لیے یہ مسئلہ لاینحل ہو گیا کہ اگر توراۃ و انجیل خدا کا کلام ہے جو حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی زندگی میں اُن پر نازل ہوا تھا تو ان میں آخر حضرت موسیٰ کے وفات پانے اور حضرت عیسیٰ کو صلیب دیئے جانے کا واقعہ کیسے مذکور ہو گیا؟ لیکن کسی شخص کو اس سے مجالِ انکار نہیں ہے کہ بعثتِ محمدی اور نزولِ قرآن سے پہلے یہی کتابیں ان لوگوں کے لیے ماخذِ دین اور مرجعِ ہدایت تھیں، اور اس وقت ان کا ماخذِ شریعت اور سرچشمۂ قانون ہونا محض اس استدلال کی بنا پر ناقابلِ تسلیم نہ تھا کہ ان میں کلامِ الٰہی، قولِ رسول، اور فقہی اجتہادات ہر چیز گڈمڈ ہے۔ ہم مسلمانوں کو تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لانا چاہیے کہ ہمارے ہاں ایسی مخدوش اور تشویش انگیز صورت اللہ کے فضل سے پیدا نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ، فقہ ہر شے بالکل الگ الگ اصل حالت میں محفوظ ہے۔

منکرینِ حدیث کو احادیثِ رسول اور سنتِ محمدیہ کے خلاف جو اندھا بہرا تعصب لاحق ہے، اُسے تھوڑی دیر کے لیے اگر وہ بالائے طاق رکھ دیں اور مندرجہ بالا حقائق پر غور کریں تو انہیں اپنے تیسرے اور آخری اعتراض کا جواب بھی انہی میں مل سکتا ہے۔ لیکن میں اس ضمن میں چند گزارشات مزید پیش کیے دیتا ہوں۔ بلاشبہ حدیث کے موجودہ مجموعوں میں مختلف اقسام کی احادیث درج ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ان کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ جس شخص کو حدیث اور فنِ حدیث سے تھوڑی بہت واقفیت ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ محدثین نے صحیح اور قابلِ اعتماد احادیث کا بہت بڑا حصہ ضعاف و موضوعات سے بالکل جدا کر دیا ہے اور موضوعات کی تو کتابیں بھی علیحدہ مرتب کر دی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حدیث کی نقد و جرح کے وہ تمام اصول، قوانین اور قواعد بھی بیان فرما دیئے ہیں جن سے کام لے کر انہوں نے احادیث کو جانچا ہے۔ اس فنی تحقیق کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی

اس کی روشنی میں ہر صاحبِ علم یہ جان سکتا ہے کہ احادیث کی قوت و ضعف کا فیصلہ کن وجوہ و دلائل کی بنا پر کیا گیا ہے اور وہ کس حد تک وزنی اور مضبوط ہیں۔ اگر محدثین کے اس محیر العقول کارنامے کے بغیر احادیث کا ملا جلا ذخیرہ ہم تک پہنچتا اور ہمارے پاس صحیح کو غیر صحیح سے ممیز کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو یہ امر بلاشبہ باعثِ تشویش ہو سکتا تھا لیکن موجودہ صورت میں پریشانی کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ پھر مزید موجبِ اطمینان امر یہ ہے کہ جن احادیث کی صحت یا ضعف پر امت کی اکثریت کا اتفاق ہے، ان کی تعداد ان احادیث کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ ہے جن کی صحت و عدمِ صحت کا معاملہ مختلف فیہ ہے۔ اب اگر کوئی شخص تھوڑی مقدار کو مشتبہ سمجھ کر پورے ذخیرے کو ساقط الاعتبار قرار دے تو اس کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہوگی جو اپنے خزانے کے چند سکوں کو کھوٹا پا کر پورا خزانہ دریا برد کر دے یا بازار میں چند جعلی نوٹوں کا چلن دیکھ کر پورے ملک کی کرنسی کو نذرِ آتش کرنے کی کوشش کرے۔ کیا کوئی زیرک و ہوشمند انسان ایسا ناعاقبت اندیشانہ اقدام کرنے کا تصور بھی کر سکتا ہے؟

اسلام اور سیاست

علامہ محمد اسد

جدید مغرب کی ذہنی فضاء میں یہ بات قریب قریب بداہت کے درجے کو پہنچ چکی ہے کہ کسی بھی مذہب کو سیاسی زندگی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، جبکہ لادینیت کا اصول فی نفسہٖ ترقی کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ عملی سیاست کو مذہبی نقطۂ نظر سے جانچنے پرکھنے کی ہر کوشش رجعت پسندی قرار دے کر بلا ادنیٰ تامل مسترد کر دی جاتی ہے۔ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، اُسے پسِ منظر میں رکھ کر میں اس بحث میں دونوں نقاط نظر میں سے کسی ایک کی بھی حمایت نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ اس مضمون میں، میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ مذہب و سیاست کے مابین جُدائی کا اصول چاہے مغرب کی سماجی اور سیاسی ضروریات کے اعتبار سے مستحکم ہو یا نہ ہو، اسلام اور عالمِ اسلام کے لحاظ سے یہ اصول فطرتاً نہایت بودا ہے۔

اس لیے ہمارے سامنے موضوعِ زیرِ بحث یہ نہیں ہے کہ سیاست کو دین کے تابع رکھنے کا ناقابلِ انکار اصول جس پر مسلمانوں کا سوادِ اعظم ایمان رکھتا ہے، مغرب کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہے یا نہیں، بلکہ فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ آیا سیاست کو مذہب کے تابع بنانے کا رجحان نظری اور تاریخی حیثیت سے عالمِ اسلام کے لیے درست ہے اور یہ کہ اسے عملاً برتا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے اس بحث کو ہم اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ:

(۱) کیا اسلام کی ساخت اس قسم کی ہے کہ وہ فی الواقع اپنے پیروکاروں سے مذہبی اخلاقیات کے مجموعی تصور میں رہتے ہوئے ایک متعین سماجی اور سیاسی طرزِ عمل یعنی

سیاسی نوعیت کی سماجی سرگرمیوں کا ایک مقررہ راستہ اختیار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے یا وہ اس عمل اور رویّے کو افراد کی پسند اور ناپسند پر چھوڑتا ہے ؟

(۲) کیا اسلام کی سماجی و سیاسی تعلیمات اتنی ٹھوس اور قابلِ عمل ہیں کہ مسلمان بیسویں صدی کے ماحول میں رہتے ہوئے ان کی اساس پر ایک حقیقی نظمِ مملکت کا تصور قائم کر سکیں؟

(۳) اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو کیا موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات اب بھی اس حد تک جاندار ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس سمت میں مؤثر اور قوی جدوجہد کرنے پر آمادہ کر سکیں جو ان کا مقتضا ہے ۔

آخری سوال کا ایک جامع جواب عالمِ اسلام کی موجودہ ذہنی، سیاسی اور جذباتی صورتِ حال کا ایک اندازہ پیش کر سکے گا اور اس اندازے سے مستقبل میں جو تغیرات رونما ہونے والے ہیں ان کے متعلق بھی پیش گوئی کی جا سکے گی ۔ تاہم چونکہ اس طرح کا اندازہ اور پیش گوئی اس مضمون کے دائرۂ بحث سے کہیں آگے نکل جائے گی اس لیے میں سردست اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتا، لیکن یہ میں بہر حال کہہ سکتا ہوں کہ چالیس سال تک ایک مسلمان کی حیثیت سے مسلمانوں کے درمیان رہ کر مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اسلام اس دَور میں بھی فی الحقیقت ایک زبردست زندہ قوت ہے اور کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں وہ روح پھونک سکتا ہے جس سے اقوام کی تقدیریں بدل جاتی ہیں ۔ میرے اس ذاتی یقین کو ادھر چند برسوں میں قیامِ پاکستان سے تاریخی تقویت پہنچی ہے جو ایک مسلم ریاست ہے اور جس کی بنا قومی اور ثقافتی ہم آہنگی کے بجائے تمام تر اسلامی نظریے پر رکھی گئی ہے ۔ اس طرح سے اس ملک کا قیام باشندگانِ ملک کی اس آرزو کی زندہ شہادت ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظام حاصل کیا جائے جس میں اسلام کا آفاقی تصور عملاً پھل پھول سکے ۔ رہی یہ بات کہ پاکستانی عوام نے جس کارِ عظیم کا بیڑہ اٹھایا ہے ، اس سے وہ عہدہ برآ ہوں گے یا نہیں تو اس کا فیصلہ تو مستقبل ہی کر سکتا ہے ۔ اس باب میں کوئی قیاس آرائی ، تخمینے اور پیش گوئی کی ایسی

قبیل میں جا داخل ہو گی جس سے پرہیز کرنے کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اس لیے میں اپنے پیش کردہ باقی کے دو سوالات پر روشنی ڈالنے سے زیادہ کچھ نہیں کروں گا۔ یعنی اولاً: کیا اسلام فی الحقیقت یہ چاہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی اعتقادات اور اس کے عملی معاشری معاملات ایک دوسرے سے مربوط اور متاثر ہوں؛ اور ثانیاً: کیا شریعت فی الواقع ایک ایسی ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے جس پر ایک جدید ریاست کی تشکیل کی جا سکے؛ دین و سیاست کا باہمی گہرا تعلق جو اسلامی تاریخ کا طرۂ امتیاز ہے اہلِ مغرب کو ایک اصولِ موضوعہ کے طور پر، اجنبی سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک مدت سے "عقیدے" اور "عمل" کو دو مختلف اقالیم کے اقامت گزین مانتے چلے آئے ہیں۔ دوسری طرف جب تک کہ اس مسئلے پر پوری طرح غور نہ کیا جائے، اس وقت تک اسلام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ سب سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جتنی شدت سے بندے اور خدا کے تعلق پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، اسی شدت سے بندے اور بندے کے تعلق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن مجید اپنے پیغام کی ابتدا چونکہ اس بنیادی نظریے سے کرتا ہے کہ فطری زندگی کے تمام پہلو مرضی الٰہی کے پابند ہیں اور اپنی ایک اخلاقی قدر و قیمت رکھتے ہیں، اس لیے اسلام اپنے آپ کو محض روحانی ارشاد و ہدایت تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ انسانی افعال و اعمال کے پورے دائرۂ کار سے بحث کرتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ یہ نقطۂ نظر سرے سے زندگی کے دینی اور دنیاوی معاملات کی تقسیم ہی کو خارج از امکان بنا دیتا ہے اور اس طرح جو "قیصر کا ہے وہ قیصر کو دے دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو" کی بھی نفی کر دیتا ہے۔ از روئے قرآن دینِ حنیف کا مقصود ہی یہ ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کے رویے پر اس طرح اثر انداز ہو کہ پورے معاشرے کے اخلاقی طرزِ عمل، خارجی قواعد و ضوابط اور اس کے سماجی و سیاسی دستور و آئین میں مثالی راست بازی کا ظہور ہو۔

وہ یہ نہیں کہتا کہ اسلام میں عیسائیت کی طرح دین کا مخاطب اساسی فرد ہے نہ کہ افراد

کا وہ خارجی اجتماع جس کو ہم معاشرے سے تعبیر کرتے ہیں۔ بلکہ اسلام سماجی ماحول سے فرد کی وابستگی کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ پیشِ نظر رکھتا ہے۔ انسان کسی خلا میں زندگی بسر نہیں کرتا ہے۔ روحانی بالیدگی اور فطری صلاحیتوں کے بہتر استعمال کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھی انسان اس کے پاسبان اور مددگار بنیں۔ اس طرح ایک معاشرے کے افراد کے باہمی تعلقات، اور ان سے معاشرے کی جو ظاہری تشکیل ہوتی ہے وہ دونوں مل کر اُس معاشرے کے ہر فرد کی رُوحانی نشوونما میں براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ چنانچہ معاشری قانون سازی اُس روحانی راست روی کے لیے ایک ناگزیر لازمہ ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا گیا ہے۔

اس مقصد کی خاطر شریعت ایسے واضح سماجی اور اقتصادی قوانین وضع کرتی ہے جو ایک طرف تو معاشرے کے تمام افراد کے لیے آگے بڑھنے کے یکساں مواقع کی ضمانت دیتے ہیں اور دوسری طرف کمزور کو طاقت ور کی اقتصادی دھاندلی سے بچاتے ہیں۔ انفرادی حقوقِ ملکیت نہ صرف یہ کہ تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ انہیں سماجی طور پر مطلوب اور اخلاقی لحاظ سے حق بجانب قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک تحفظ ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی قرآن مجید اس بات کی تصریح کر دیتا ہے کہ آخر کار ہر شے کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اس سے استفادے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ نہ اس سے اصل شے کو نقصان پہنچے نہ من حیث المجموع معاشرے کا مفاد اس سے متاثر ہو۔ نتیجتاً انفرادی ہاتھوں میں حد سے زیادہ دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مجموعۂ قوانین اس غرض کے لیے بنایا گیا ہے کہ افراد کے پاس جو دولت جائز ذرائع سے جمع ہو وہ بھی افراد کے علاوہ مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لیے نفع بخش ہو۔ اس قسم کے چند قوانین چونکہ معاشیات میں اسلام کا نادر المثال اضافہ ہیں، اس لیے ہمیں خاص طور پر ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ جن قوانین کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں ان میں ایک تو لازمی دینی ٹیکس کا وہ قانون ہے جس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جاری ٹیکس ہے جو مقررہ شرح کے ساتھ بیک وقت آمدنی اور سرمایے پر عائد ہوتا ہے۔

ایک اسلامی حکومت یہ ٹیکس دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ وصول کر سکتی ہے جو ضروری سمجھے جائیں۔ دوسرے میت کے رشتے داروں میں ترکے کی لازمی تقسیم، جس کی حقدار صرف اس کی اولاد ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی (یا بیویاں)، ماں باپ اور بھائی بہنیں بھی ہیں۔ تیسرے اس سرمائے پر سود کے لین دین کی قطعی ممانعت جو قرض لیا یا دیا گیا ہو، خواہ زیادہ ہو یا کم۔ چوتھے ہر قسم کے قمار کی ممانعت۔ اس میں تجارتی سٹہ، اجارہ داری اور قابلِ فروخت اشیاء کی ذخیرہ اندوزی بھی شامل ہے۔ پانچویں مزدور کا یہ حق کہ وہ اپنے آجر کے کاروبار کے منافع میں سے بقدر حصہ رسدی وصول کرے۔ چھٹے یہ کہ تمام زمین اصلاً خدا کی ملکیت ہے۔ زمیندار اس سے نفع اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے خود کاشت کرے یا براہ راست اس کا انتظام کرے۔ اس حکم کو اگر پوری طرح ملحوظ رکھا جائے تو تمام بڑی بڑی جاگیریں از خود ختم ہو جائیں گی، سوائے ان کے جو امدادِ باہمی کے اصول پر قائم ہوں۔ اس طرح وہ جاگیرداری نظام بھی خلافِ قانون قرار پائے گا جس میں ایک زمیندار دوسروں کی محنت کا پھل بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے گھر بیٹھ کر کھاتا ہے۔

"پوری طرح ملحوظ رکھنے" کی جو شرط میں نے ابھی ابھی لگائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ صدیوں سے مسلمان اس پہلو سے غفلت برتتے رہے ہیں اور بیشتر مسلم ممالک کی اقتصادی بدحالی کا اصل سبب بھی جائدادِ ارضی کا چند ہاتھوں میں جاگیردارانہ ارتکاز ہے جس کا نتیجہ سینکڑوں بندگانِ خدا کے اقتصادی استحصال کی صورت میں نکلتا ہے۔ بہرحال یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس وقت ہم شریعت کے احکام کا تذکرہ کر رہے ہیں، نہ کہ اِن احکامات کی اُن خلاف ورزیوں کا جن کا ارتکاب ماضی و حال کے مسلمان کرتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ، اسلام کی روح سے معمور اور اس کے احکام کی تابع ایک سوسائٹی کے قیام کی آرزو، جو سینکڑوں مسلمانوں کے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے، اپنے دامن میں اس حقیقت کی واضح شہادت رکھتی ہے کہ نہ صرف انہیں اپنی کوتاہیوں کا پورا شعور ہے بلکہ وہ صدیوں سے دینی اور معاشرتی انحطاط کی جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے نکلنا بھی چاہتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جس قسم کا تمدّنی نظام اسلام تجویز کرتا ہے، وہ محض روحانی ارشاد کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا۔ چنانچہ اسلام اپنی مخصوص حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے جو انسان کی روحانی قوتوں کے ساتھ ساتھ اس کی فطری کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ایک ایسی متعین سیاسی ہیئت کا مطالبہ کرتا ہے جو سنت کی مقرر کردہ معاشرتی حدود کا تحفظ کرے۔ بالفاظ دیگر "حقیقی اسلامی ریاست"، اسلام کے معاشرتی نظام کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی نظر میں ایک اسلامی ریاست کی صورت کیا ہونی چاہیے اور اس کے فرائضِ منصبی کیا ہوں؟ اس ضمن میں آگے بڑھنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کی اصطلاح کا وہ مفہوم واضح کر دوں جس مفہوم میں، میں اس وقت یہ اصطلاح استعمال کر رہا ہوں۔ میں پورے شعور کے ساتھ اس اصطلاح کو قرآن مجید اور سنتِ ثابتہ کے غیر مبہم احکامات تک محدود کرتا ہوں یعنی قرآن و سنت کے وہ فرامین جو قانونی انداز میں صادر ہوتے ہیں۔ جن میں کسی فعل کا حکم دیا گیا ہے، یا کسی فعل سے روکا گیا ہے، یا کسی امر کی تحسین کرتے ہوئے اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، یا کسی امر کی مذمت کرتے ہوئے اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمام معاصر مسلمان اسلامی قانون کے دائرۂ کار کو اس طرح محدود کر دینے پر مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے۔ ان میں سے بیشتر کی رائے میں اسلامی قانون کو محض قرآن و سنت کے واضح احکامات تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے نزدیک اسلامی قانون میں پہلی تین چار صدیوں کے علماء کے ان فتاویٰ کا اضافی نظام بھی شامل ہے جن تک ان کی رسائی مختلف استخراجی مراحل طے کرنے کے بعد ہوئی ہے۔ اصلاً یہ فتاویٰ متعین مسائل اور قانونی اشکالات پر قرآن و سنت کے احکام کے انطباق میں آسانی پیدا کرنے کے لیے دیئے گئے تھے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ فتاویٰ بذاتِ خود اعزاز و اتباع کے اسی درجے کو پہنچ گئے جس درجے پر قرآن و سنت کے احکامات فائز ہیں اور بہت سے مسلمانوں نے انہیں اسلامی قانون کا جزو لاینفک سمجھنا شروع کر دیا۔ اس نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قرآن و سنت کے

احکام تنہا تمام ممکنہ قانونی مسائل کا احاطہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے قیاس و استنباط کے ذریعہ سے مجموعۂ قوانین میں توسیع ضروری ہے۔ لیکن ایک شخص بالکل بجا طور پر یہ استدلال کر سکتا ہے، جیسا کہ مسلمان علماء کی ایک معقول تعداد مدت دراز سے استدلال کرتی آرہی ہے کہ اصل اسلامی قانون کے دائرۂ کار کے محدود ہونے کا سبب (العیاذ باللہ) شارع کی چوک نہیں تھی بلکہ اس کا اصل سبب قانونی اور معاشری جمود کے خلاف ایک ناگزیر تحفظ بہم پہنچانا تھا۔ اس کی منشا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ایسے اخلاقی حدود کھینچ دے جن میں رہتے ہوئے معاشرہ پھل پھول سکے۔ اور وقتاً فوقتاً جو قانونی مسائل پیدا ہوتے رہیں، انہیں بعد کی نسلوں کے فیصلوں پر چھوڑ دیا جائے ـــــ ایسے فیصلے جو کتاب و سنت کی روشنی میں وقت اور بدلتے ہوئے معاشری حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کیے جائیں۔

اسلامی قانون کا یہ تصور کوئی انوکھا اور اچھوتا تصور نہیں ہے۔ سلف میں چند ممتاز مسلمان ماہرینِ قانون نے قریب قریب یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ جن میں سرِفہرست علامہ ابن حزم اندلسی (۹۹۴-۱۰۶۴ء) ہیں۔ موجودہ زمانے کے بھی اکثر و بیشتر علماء اسی طرزِ استدلال کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ میری طرح وہ بھی یہ قرار دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے غیر مبہم احکام بلاشبہ ناقابلِ تغیر و تبدل اساسی اسلامی قانون کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نافذ رہنے چاہییں لیکن اس شرعی قانون کے ساتھ ہی ساتھ، مسلمانوں کو اجازت کیا معنی، واضح طور پر ان کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسا تغیر پذیر قانون تیار کریں جو الٰہی قانون کی روح اور اس کے احکامات کو وقتی معاشری تقاضوں پر منطبق کرے۔

اس زاویے سے جب ہم اسلامی قانون کے مسائل پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے دو نتیجے ابھر آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس طرح شرعی قانون وہ لچک حاصل کر لیتا ہے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے بنیادی قانونی ڈھانچے میں سراسر ناپید ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک اسلامی ریاست کی صدارت اور اس کے فرائضِ منصبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ

وہ تاریخی نظائر کا پورا عکس ہوں، اور یہی امر ایک اسلامی ریاست کے مسائل سے سب سے زیادہ متعلق ہے۔ ایک ریاست سے "صحیح اسلامی ریاست" کہلانے کے لیے جو کچھ مطالبہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے دستور اور اس کے افعال میں قرآن و سنت کے واضح احکامات کا جن سے معاشرے کی سیاسی زندگی براہِ راست متاثر ہوتی ہے، پوری طرح ظہور ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کے اس طرح کے احکامات کا دائرۂ اثر پوری طرح واضح ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے احکامات ان معاشری و اقتصادی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بہت وسیع میدان کھلا چھوڑ دیتے ہیں جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید کا یہ حکم "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" دلالت کرتا ہے کہ حکمرانی کی سند بہرحال قرآن و سنت سے حاصل کی جانی چاہیے اور مسلمان معاشرے کے ایک رکن ہی کے قبضے میں رہنی چاہیے۔ بالفاظِ دیگر ایک مسلمان ہی سربراہ مملکت ہو سکتا ہے۔ یہ شرط اسلامی ریاست کی اس خصوصیت کی وجہ سے لگائی گئی ہے کہ اس ریاست کی بنیاد ایک خاص نظریے پر رکھی گئی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کو شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

سماجی

زندگی کے تمام شعبے غیر مسلم شہریوں کے لیے بھی اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح مسلم شہریوں کے لیے۔ وہ مساوی حقوق کے مالک ہیں اور انہیں اپنے سماجی، مذہبی اور ثقافتی مفادات کا یکساں تحفظ حاصل ہے۔

یہ چیز ہمیں ایک صحیح اسلامی ریاست کے دستور کے ایک اور مہتم بالشان نکتے تک لے جاتی ہے، یعنی نظم و نسقِ سلطنت کا وہ اصول جس کا اظہار قرآنی الفاظ میں "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" سے کیا گیا ہے۔ حکومتی مشینری کو جو شکل بھی دی جائے، اگر حکومت کا انحصار رضامندیٔ جمہور پر نہیں ہے اور وہ جمہوری رجحانات کی آئینہ دار نہیں ہے تو اسے "اسلامی" ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن مجید میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکامات

وقتاً فوقتاً دیئے ہیں ان کی رو سے انتظامیہ اور مقننہ کا قیام بذریعہ انتخاب عمل میں آنا چاہیے
اس انتخاب کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے، اور یہ کتنی مدت کے لیے ہونا چاہیے، ان سوالات
کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ ہر زمانے اور ہر ہیئتِ اجتماعی کی اپنی ضروریات کے لیے وسیع تر
میدان موجود رہے۔ جو لوگ سیاست کو بغرضِ نشاط استعمال کرتے ہیں یا جنھوں نے اسے بطور
پیشے کے اپنایا ہے، ان کی روک تھام کے لیے امیدواری کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعیت
کے ساتھ ممنوع کر دیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ امیدوار ہونا غلط ہے بلکہ جو شخص اپنے حق میں کسی
عہدے کی خاطر رائے ہموار کرے وہ از خود نااہل قرار پاجائے گا۔

میں نے تھوڑی دیر قبل ذکر کیا تھا کہ اسلام کے اس قانون کے ساتھ جو نصوص سے
ثابت ہے اور جس کو ایک اسلامی دستور کی بنیاد کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہنا چاہیے،
ایک مسلسل اور تغیر پذیر اضافی قانون سازی بھی ہونی چاہیے جو ان معاملات سے متعلق ہو جن کے
بارے میں کوئی حکم یا تو قانونِ شریعت نے بالکل نہیں دیا، یا دیا بھی ہے تو محض اجمالی طور پر۔ روزمرہ
کی قانون سازی کا یہ فرض ایک منتخب پارلیمانی ادارہ اس مفروضہ پر انجام دے گا کہ اسلام کا
اساسی قانون، قانونِ اعلیٰ کی حیثیت سے موجود رہے گا اور کوئی قانون اس قانونِ اعلیٰ کے
الفاظ اور روح کے منافی نہیں ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں ایک اسلامی ریاست میں روزمرّہ کی قانون سازی کا پہلا کام یہ
ہے کہ ایسا سیاسی ڈھانچہ تیار کرے جس میں اساسی قانون پوری طرح روبعمل آسکے۔ دوم یہ کہ
معاشرے کے معاشی و سیاسی مفادات کی اندرونی و بیرونی خطرات سے حفاظت کرے اور
سوم یہ کہ ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جس میں ہر شہری کو پورا روحانی اور جسمانی
تحفظ حاصل ہو۔ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و
مسلمۃ"[1] کے مطابق ریاست کو لازمی اور مفت تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے اسی طرح

[1] ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ (مترجم)

فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لیس المؤمن الذی یشبع و جارہ جائع الی جنبہ[1] کی روشنی میں ریاست ہر شہری کو وسائلِ حیات مہیا کرنے کی براہِ راست ذمہ دار ہے۔ غرض جدید اصطلاح میں اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے جس میں افراد کے مفادات بحیثیت مجموعی معاشرے کے مفادات کے تحت جگہ پاتے ہیں۔

اسلام اس بات کو بھی صاف کر دیتا ہے کہ معاشرے کے مفادات فی نفسہ برتر نہیں ہیں، بلکہ ان کی فوقیت مشروط ہے۔ ان اخلاقی حدود سے جو قرآن مجید نے انسان کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی نظر میں عصبیت جاہلیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو کوئی غلط کام میں اپنی قوم کی حمایت کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے"[2]

یہ فرمان قوم پرستانہ تعصب کی تمام اقسام کی نفی کر دیتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ بذاتِ خود قوم پرستی کی بھی نفی کر دیتا ہے جس کی مذمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس منّا من دعا الی عصبیۃ ولیس منا من قاتل عصبیۃً ولیس منّا من مات علیٰ عصبیۃٍ[3]

الغرض اگر قرآن وسنت کے آئینے میں اسلامی ریاست کا عکس دیکھا جائے تو وہ خالصتاً ایک نظریاتی مملکت نظر آئے گی جس میں نسلی اور قومی ترجیحات اور وفاداریوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوگی جس میں تمام تر سرگرمیاں اخلاقی نقطۂ نظر کی حامل ہوں گی، نہ کہ مصلحت کوشیوں کی۔

یہ سب کچھ ہے تو بڑا پرکشش، لیکن کیا ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کی کوشش نفسیاتی

---

[1] وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے اور دیوار بیچ اس کا ہمسایہ بھوکا ہو (مترجم)

[2] فاضل مصنف نے حدیث کا ترجمہ بلا حوالہ درج کر دیا ہے۔ ہم باوجود کوشش کے اصل الفاظ تلاش نہیں کر سکے۔

[3] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنیاد پر جنگ کرے اور وہ بھی نہیں ہے جو عصبیت کی حالت میں مرے (مترجم)

تک نہیں پہنچا سے گی؟ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے شکوک و شبہات اہلِ مغرب کے دل میں پیدا ہوں جس کا سبب وہ اضطراب ہے جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے ایک خاص دور کی تلخ یادوں کا ثمرہ ہے

بہرحال اس سوال کا جواب میں "ہاں" اور "نہیں" دونوں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر تھیا کریسی کا تصور کسی ایسے معاشرتی نظام کی علامت قرار پائے جس میں ہر قسم کی قانون سازی، خواہ وہ وقتی اور ہنگامی ہی کیوں نہ ہو، مذہبی اصولوں کے تحت کی جاتی ہے یا مسئلہ زیرِ بحث میں قرآن مجید کی سند پر کی جائے جس کو تمام مسلمان غیر متنازع فیہ مانتے ہیں تو میں کہوں گا کہ بلاشبہ یہ ایک مخفیا کریسی ہے۔ اس کے برعکس اگر اس سوال کا اصل منشاء اسلامی تھیا کریسی اور یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے گرجا راج (RULE OF THE CHURCH) کا موازنہ کرنا ہے تو پھر میرا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ اسلام میں منظم چرچ کی قسم کی کوئی شے نہیں پائی جاتی، اور اس کے لیے صرف یہی وجہ کافی ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کے لیے عشاءِ ربانی اور رسوم باطنی کا تصور ایک بالکل ہی انجانا تصور ہے۔ ایک مسلم معاشرے میں جہاں ہر بالغ مسلمان تمام مذہبی فرائض ادا کرنے کا پوری طرح مجاز ہے، کسی برہمنیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ خطرہ قطعاً باقی نہیں رہتا کہ سیاسی طاقت پیشوائیت کی باندی بن جائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کے مسائل کا تعلق ہے، تھیا کریسی کی طرف سے عدم اطمینان کی کیفیت جو مغرب میں عام ہے، بے اصل ہے۔ جو مسلمان اس وقت ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشاں ہیں، ان کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسی سیاسی تنظیم قائم کی جائے جس کے زیرِ سایہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنے ایمان کا مظاہرہ صرف مسجد ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں کر سکیں۔ میرے خیال میں شکوک و شبہات کے اظہار سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ان تمام عیسائیوں کو جو خود اپنے مذہب میں پوری طرح سنجیدہ ہیں، ایک یکساں اخلاقی نقطۂ نظر رکھنے والی دوسری ملت کی ان کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کے نتیجے میں ایمان باللہ کی بنیاد پر ایک معاشرے اور ایک ریاست کی تعمیر کا امکان ہو۔ (ترجمہ: عمر فاروق)

اسلام اور مغربی تہذیب

شیخ مصطفیٰ السباعی (مرحوم)

[شیخ مصطفیٰ السباعی سالہا سال تک شام میں اخوان المسلمون کی تحریک کے لیڈر رہے ہیں۔ اور اب کئی سال سے دمشق کی کلیۂ شریعہ کے پرنسپل اور رسالہ حضارۃ الاسلام کے ایڈیٹر تھے۔ حال میں ان کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ ان کی وفات درحقیقت تمام دنیائے اسلام کے لیے ایک نقصانِ عظیم ہے۔

سال گذشتہ وہ اپنے علاج کے سلسلے میں مغربی جرمنی گئے تھے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ واپسی پر دمشق میں ایک جرمن صحافی سے ان کی جو گفتگو ہوئی تھی اسے یہاں مجلۂ حضارۃ الاسلام سے نقل کیا جارہا ہے۔ — ع۔ ف]

جرمن صحافی نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے سوال کیا کہ استعمار اور معاشرتی پس ماندگی کے خلاف مسلمانوں میں جو تحریکات چل رہی ہیں ان کے بارے میں اسلام کا موقف کیا ہے؟

ڈاکٹر سباعی نے جواب دیا کہ اسلام دین آزادی ہے۔ وہ نہ یہ پسند کرتا ہے کہ مسلمان کسی بھی سامراجی کے آگے جھکیں اور نہ یہ کہ وہ کاروبار زندگانی میں پیچھے رہ جائیں۔ اسلام ہی کی تعلیمات نے عربوں کو چودہ سو برس سے ہر قسم کے بیہودہ رسم و رواج سے محفوظ رکھا ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے عربوں کو امن و انصاف اور آزادی کا پیغامبر بنا کر اقوامِ عالم کی طرف بھیجا، انہیں تہذیب سکھائی، ان کی آنکھوں سے جہالت کے پردے ہٹائے، انہیں تمام بندگیوں سے آزاد کر کے ایک خدا کا بندہ بنایا اور ان کے اندر انسانی بھائی چارے کی وہ روح پھونکی جو کوئی دوسرا قدیم و جدید دین یا فلسفہ پھونکنے پر قادر نہ تھا۔

جرمن صحافی - تو پھر کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمان متمدن اقوام سے پیچھے رہ گئے ہیں؟

ڈاکٹر سباعی - اس کے بہت سے اسباب ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ اہم سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ سامراج سے متاثر ہے - اور سامراج جب سے مسلمان ممالک اس میں گرفتار ہوے ہیں، اپنے تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ پیہم اسلام کی بیخ کنی کرنے، اس کی تعلیمات کا حلیہ بگاڑنے اور نئی نسلوں کو اس کی روح سے بیگانہ کرنے میں مصروف رہا ہے - چنانچہ اقوام مغربی دراصل اسلام کی طرف مسلمانوں کی بازگشت میں سنگِ گراں بنی ہوئی ہیں -

جرمن صحافی - یہ بات روس کے بارے میں تو درست ہو سکتی ہے، لیکن جہاں تک مغرب کا سوال ہے، میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس اسلام سے محارب ہیں -

ڈاکٹر سباعی: اسلام کے ساتھ اس عداوت میں شرق و غرب کی شرکت میں ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے - میں ابھی چند روز قبل مغربی جرمنی سے واپس آیا ہوں - جو کچھ میں نے وہاں دیکھا، اسے میں آپ کے سامنے مغرب کی اسلام دشمنی کے ثبوت میں بطور مثال کے عرض کرتا ہوں مجھے اس چیز نے پریشان کر دیا کہ وہاں ہر میدان میں خواہ وہ فکر و نظر کا میدان ہو یا پراپگنڈے کا، یونیورسٹی ہو یا گرجا یا نجی مجالس، ریڈیو ہو یا ٹیلیویژن، غرض ہر جگہ اسلام کے حقائق کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ایک منظم منصوبہ موجود ہے - کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں؟

جرمن صحافی - یہ درست ہے، ہو سکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ آپ تہذیب کا ساتھ دینے کے بجائے پیچھے رہ گئے -

ڈاکٹر سباعی: ہم کس میدان میں آپ کو اپنی تہذیب سے پس ماندہ نظر آتے ہیں؟

جرمن صحافی - عورت ہی کے مقام کو لے لیجیے - آپ یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ مجالس و محافل اور رقص و سرود میں شرکت کرے - آپ مصر ہیں کہ وہ کارخانوں میں کام نہ کرے -

ڈاکٹر سباعی - کیا آپ کے ہاں، گھر سے نکلنے کے بعد عورت کا مقام معاشرتی نقطۂ نظر سے

محفوظ و مامون رہ گیا ہے ؟ کیا اس چیز نے آپ کو گھریلو نظام کی تباہی تک نہیں پہنچا دیا اور کیا سال بہ سال آپ کے ہاں اخلاقی جرائم اور ناجائز اولاد میں اضافہ نہیں ہو رہا ؟

جرمن صحافی - میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ہمارا گھریلو نظام بری طرح تباہ ہو چکا ہے - اور اس تباہی کے ہاتھوں ہم نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ ایک ایسا تاوان ہے جس سے ہم علمی ترقی کے ذریعے عہدہ برآ ہو گئے ہیں -

ڈاکٹر سباعی - جب کہ آپ پر عورت کے عام محفلوں میں جانے کے نقائص اور مضرات واضح ہو چکے ہیں تو پھر آپ ہم پر اپنا فلسفہ کیوں ٹھونسنا چاہتے ہیں - حالانکہ آپ خود اس کی بہت بڑی قیمت ادا کر چکے ہیں اور ہم سے ہمارا فلسفہ کیوں چھڑانا چاہتے ہیں جس نے ہمارے گھریلو نظام کی مسلسل ایک ٹھوس ستون کی طرح حفاظت کی ہے -

جرمن صحافی - مَیں چاہتا ہوں کہ اس نکتے کی وضاحت کر دوں : آپ ہماری علمی ترقی کے حاجت مند ہیں - اور ہم آپ کو یہ ترقی دے بھی سکتے ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر آپ یہ چاہیں کہ ہماری تہذیب کا کوئی ایک پہلو لے لیں تو ایسا نہیں ہو سکتا بلکہ آپ کو یہ کل کی کل ، اپنے تمام محاسن و معائب کے ساتھ لینی پڑے گی اور آپ کو اس کی وہی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو ہم کر چکے ہیں -

ڈاکٹر سباعی - میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کے ہاں عورت کا خروج اور اس کا کارخانوں میں کام کرنا ایک تہذیبی اساس کی حیثیت رکھتا تھا اور کیا آپ کی تہذیب اس کے بغیر نہیں چل سکتی تھی ۔

جرمن صحافی - جب ہماری صنعتی ترقی کی ابتدا ہوئی اس وقت ہمارے ہاں مردوں کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ صنعتی پیداوار کے لیے کافی ہو سکتی - اس لیے اس بات پر ہم مجبور ہو گئے کہ عورتیں بھی کارخانوں میں جا کر کام کریں -

ڈاکٹر سباعی - تو پھر آپ ہم سے اس چیز کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں جسے آپ نے تو مجبوراً

اختیار کیا لیکن ہم اسے اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ اور میری رائے میں تو دراصل آپ کو دو امور نے عورت کو اس کے گھر سے نکال کر عمومی زندگی میں لانے پر مجبور کیا ہے۔ اوّلاً یہ کہ آپ لوگ ہر وقت اور ہر جگہ عورت کو اپنے پہلو میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ثانیاً آپ لوگ اس کے اخراجات بحیثیت بیوی یا بیٹی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے آپ نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کارخانوں میں جائے اور اپنے اخراجات خود اٹھائے۔ ان دونوں وجوہات کا ہمارے ہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ اسلام اس قسم کے اختلاط کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ ہمارے ہاں مرد ہر جگہ عورت کو دیکھنے کا خواہش مند نہیں ہے اور اسلام کا نظام نفقات ایک مرد کے لیے یہ لازم کرتا ہے کہ وہ اپنی ماں، بیوی اور بیٹی کے اخراجات برداشت کرے یہاں تک کہ وہ شادی کرلے۔ یہی چیز عورت کو ان فرائض کی ادائی کے لیے فارغ کر دیتی ہے جو اس پر گھر اور بچوں کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے گھریلو نظام کے استحکام اور اپنے معیارِ اخلاق کی بلندی کو باقی رکھتے ہوئے بھی آپ کی علمی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کے مشہور رسالے "سیٹرن" نے اپنی گذشتہ ستمبر کی اشاعت میں جرمنی میں مزدور عورتوں کے بارے میں ایک تحقیقی فیچر شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کی اکثریت اس لیے کام کرتی ہے کہ کوئی ان کے اخراجات برداشت کرنے والا نہیں ہے نیز یہ کہ اس طرح اپنے ہم کاروں ہی میں سے انہیں شوہر کے حصول کی بھی امید ہوتی ہے۔ اور یہ دو وجوہات ہمارے ہاں عورت نہیں پاتی کہ ان کی بنا پر وہ کام کرنے پر مجبور ہو۔

جرمن صحافی۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ ہماری تہذیب کی مضرتوں سے بچ نہیں سکیں گے۔

ڈاکٹر سباعی۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ممکن ہے بشرطیکہ ہمارے ہاں ایسی حکومتیں ہوں جو ہماری ترقی کو صحیح سمت میں عزتِ نفس کے جذبے سے سرشار ہو کر اور کورانہ تقلید سے پاک کر ڈال سکیں۔

جرمن صحافی۔ ہم ایک اور موضوع لیتے ہیں۔ یورپ میں کیتھولک کلیسا اپنی لچک اور انتقاد کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں اپنے مقام کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیا اسلام

ہیں بھی اتنی لچک ہے کہ وہ زندگی کے ارتقاء کا ساتھ دے سکے ؟

ڈاکٹر سباعی ۔ اس کے لیے ہمیں مفاہیم کو متعین کر لینا چاہیے ۔ آخر لچک اور ارتقاء سے مراد کیا ہے ؟ آیا لچک اور ارتقاء وہی ہے جس کا نظارہ ہم نے یورپ میں کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے ہاں کلیسا کی لچک نوجوان مردوں اور عورتوں کے افتتاح نواد کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے جس میں رقص و شرب کی محفلیں پادری کی نگرانی میں جمتی ہیں ۔ بلکہ وہی ان کا افتتاح رقص و شراب کے ساتھ کرتا ہے ۔ اس نواد میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط پکنک پارٹیاں ہوتی ہیں جن میں ان اخلاقی جرائم کا عدم وقوع محال ہوتا ہے جن کی نفی ہیں تمام ادیان و مذاہب متفق ہیں ۔ سو اگر آپ اسلام سے بھی یہ چاہتے ہیں کہ اس میں بھی ایسی ہی لچک پیدا ہو جائے تو یہ تو ہونے سے رہا ۔ دراصل اسلام کے کچھ آداب اور اس کا ایک خاص نظام ہے جس سے اگر خروج کیا جائے گا تو وہ کوئی دین جدید تو ہو سکتا ہے اسلام نہیں ہو سکتا ۔ اور پھر آخر اس دین کا فائدہ ہی کیا ہے جو طبیعت کی طغیانی پر بند نہ باندھے اور گناہ و نافرمانی پر حد نہ لگائے ۔

جرمن صحافی ۔ پھر تو آپ کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ کیتھولک کلیسہ نے عوام کے دلوں میں اپنے اثر کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتی ہے اور اسی چیز کا خطرہ مجھے اسلام کے بارے ہے کہ اس میں بھی لچک نہیں ہے ۔

ڈاکٹر سباعی ۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کی نظر میں زنا اور شراب نوشی مضر ہیں یا نہیں ؟

جرمن صحافی ۔ مضر ہی نہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں حرام ہیں ۔

ڈاکٹر سباعی ۔ لیکن کلیسا تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ۔ خود جرمنی میں صوم کبیر سے پہلے کارنیوال کے مہینوں میں جو جشن مسلسل تین دن تک کلیسا کے علم اور اس کی نگرانی میں منایا جاتا ہے اس میں لوگوں کو ہر قسم کی اخلاقی اور دینی چھوٹ دے دی جاتی ہے ۔ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر سال کارنیوال کے بعد کنواری حاملاؤں کی تعداد پچھلے سال کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے

اس کے بعد وہ اور کونسا اثر ہے جو لوگوں کے دلوں میں کلیسا کا باقی رہ جاتا ہے؟ یہ کس قسم کی لچک ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ اسلام میں بھی پیدا ہو جائے؟ شاید آپ کو یہ بات معلوم ہوگی کہ آپ کے ہاں لوگوں کو کلیسا کے ساتھ اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ آپ چاہتے ہیں کہ ہو۔ بلکہ حکومت کی پشت پناہی اور لوگوں پر کلیسائی ٹیکس لگانے کے باوجود کلیسا سے بیزاری دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ بعض جرمنوں نے تو بدھ مت اختیار کر کے فرنکفرٹ میں باقاعدہ مندر تک بنا لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بدھ مت بت پرستی ہے۔ انسانی عقل نے بعض اقوام میں اسے اس زمانے میں قبول کیا تھا جبکہ جہالت اور تاریکی کا دور دورہ تھا۔ کیا یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ اس بیسویں صدی میں یورپی عقل اس بت پرستی کو قبول کر رہی ہے اور اس کے لیے مندر تعمیر کر رہی ہے؟ لوگوں کے دلوں میں کلیسا کا وہ اثر ہے کہاں جس کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں؟ اگر آپ اسلام سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی لچک دار ہو جائے اور لوگوں کو ہوا و ہوس میں کھل کھیلنے کی چھٹی دے دے تو میں آپ پر واضح کر دیتا ہوں کہ اس قسم کی لچک تو اسلام میں موجود نہیں ہے۔ البتہ جو لچک اسلام میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ ہر اچھی چیز سے استفادہ کیا جائے۔ علم اور فکری ارتقاء کے وسائل اختیار کیے جائیں۔ اس لچک کا اظہار خود آپ کے ہاں اور یورپ اور امریکہ میں ہمارے وہ سینکڑوں اسلام پسند نوجوان کرتے ہیں جو آپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں اور آپ کی تہذیب کے عین قلب میں رہتے ہوئے بھی اپنے اخلاق و کردار کی حفاظت کرتے ہیں، جیسا کہ اسلام ان سے مطالبہ کرتا ہے۔ نہ شراب پیتے ہیں، نہ بے راہ روی اختیار کرتے ہیں، نہ ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ان کے اساتذہ اور ان کے ہمسایوں کے نزدیک ان کا مقام بلند ہو جاتا ہے۔ میں خود سن چکا ہوں کہ جرمن اور دوسرے یورپین ان کے شریفانہ کردار پر کس قدر حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ مجھ سے ایک جرمن نے جو ایسے ہی ایک نوجوان اور اس کی استقامت سے واقف تھا کہا کہ یہ نوجوان تو راہب معلوم ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج ساری دنیا میں ان سے اخلاق اور استقامت کا اونچی کوئی ہوگا۔ اسلام میں اگر کوئی لچک ہے تو بس یہی اس

کی مثال ہے۔ اسلام علم کا خیر مقدم کرتا ہے، تہذیب و تمدن سے استفادہ کرتا ہے لیکن ان کے معائب اور نقائص سے دامن بچاتا ہے۔ اور یہی دلیل ہے اس بات کی کہ ہم آپ کی تہذیب اور علمی ترقی سے استفادہ کر سکتے ہیں بغیر اس کے کہ آپ کی تہذیب کے کانٹوں سے دامن دریدہ ہوں۔

جرمن صحافی۔ یہ صحیح ہے۔ مجھے جرمنی میں اسی طرح کے چند نوجوانوں کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کی ترغیبات و تحریصات سے جس طرح ان لوگوں نے اعراض کیا ہے میں خود اس پر دنگ رہ گیا۔ حتیٰ کہ میں نے جب اپنی ایک نشری گفتگو میں کہا کہ جرمنی اور یورپ کے مختلف ممالک میں ۲۴، ۲۴ اور ۲۵، ۲۵ برس کے ایسے نوجوان رہتے ہیں جو لذت وصال سے نا آشنا ہیں تو کسی نے میری بات پر اعتبار نہ کیا۔ البتہ جہاں تک کارنیوال کا تعلق ہے تو شاید اس کا سبب کیتھولک مذہب کا "اعتراف" ہے جو اسلام میں موجود نہیں ہے۔ اور یہی چیز آپ کے نوجوانوں کو عیاشیوں میں غرق ہونے سے روکتی ہے۔

ڈاکٹر سباعی۔ اسی سے آپ دیکھیے کہ ہم آپ کے ہاں اس وجہ سے نہیں جاتے ہیں کہ آپ کی اجتماعی زندگی کے انداز اور اس کی اخلاقی قدریں ہمیں بھا گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آپ کی لغزشوں میں حصہ دار بنے بغیر آپ کی علمی ترقی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

جرمن صحافی۔ میں آپ کا از حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے ایک ایسی حقیقت سے روشناس کیا ہے جس سے ہم اب تک غافل تھے اور وہ یہ کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کے مظاہر سے آپ کو مرعوب نہیں کر سکتے۔ آپ اس کے معائب سے پوری طرح باخبر ہیں اور اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح میں اس بات کے لیے بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اسلام کے بارے میں میری غلط فہمیاں رفع کر دیں۔ آج تک مجھے اپنے متعلق یہ خیال رہا کہ میں سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں اور ان کے تہذیبی مسائل کو جانتا ہوں لیکن آپ نے مجھے بتا دیا کہ میں بہت کچھ نہیں جانتا۔ خدا حافظ۔ (ترجمہ: عمر فاروق)

عہدِ جاہلیت میں عربوں کے مذہبی معتقدات

(عبد الحمید صدیقی)

دنیا کا کوئی نظامِ حیات نہ خلا میں پیدا ہوتا ہے اور نہ خلا میں پروان چڑھتا ہے بلکہ ہر نظام ایک خاص ماحول میں جنم لیتا ہے اور رائج الوقت نظام سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ہر نئے نظام کی روح، اس کے اساسی تصورات اور اس کے عملی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اُس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں جس میں وہ نظامِ حیات معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہی فطری اصول ہمیں اسلام کے معاملے میں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ اگر قرآن مجید کی تصریحات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلاب انگیز تعلیمات کے مضمرات کو پوری طرح جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے اُس پس منظر کو ذہن نشین کریں جس میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس مضمون میں ہم عربوں کے صرف مذہبی معتقدات پر بحث کریں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مثبت طور پر جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ توحید ہے اور جس باطل خیال کا پوری شدت کے ساتھ ابطال کیا ہے وہ شرک ہے۔ عربوں کے اندر یوں تو شرک کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو مگر اس میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت بُت پرستی کو حاصل تھی۔ اس لیے ہم سب سے پہلے قدیم عربوں کی بت پرستی کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔

عرب میں بُت پرستی کا آغاز: عرب میں بُت پرستی کا آغاز خانہ کعبہ کی عقیدت کے پاکیزہ جذبے

[1] اس موضوع کے لیے ہم نے زیادہ تر مولوا بی المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الاصنام سے لیا ہے۔

شروع ہوا۔ جو شخص بھی مکہ سے عارضی یا مستقل طور پر جدا ہوتا وہ حرم کے مقدس پتھروں میں سے ایک آدھ پتھر عقیدت کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہ اسے ایک خاص مقام پر نصب کر لیتا اور اس کے گرد اسی طرح طواف کرتا جس طرح کہ قیامِ مکہ کے دنوں میں وہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کیا کرتا تھا۔ وہ اس پتھر سے حرم کے تعلق کی بنا پر خیر و برکت کا طالب ہوتا اور اس کے ساتھ اُسی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتا جو ایک نیک اور خدا ترس انسان اللہ کے مقدس گھر سے کرتا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے عرب میں دینِ ابراہیم کو مسخ کر کے بُت پرستی کا آغاز کیا وہ قبیلہ خزاعہ کا سردار عمرو بن ربیعہ لحی بن حارثہ بن عمرو بن عامر الازدی تھا۔ کعبہ کی تولیت پہلے الحارث کے سپرد تھی مگر جب عمرو بن لحی مکہ میں قیام پذیر ہوا تو اس نے حارث کے حق تولیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی اولاد کی مدد سے حارث اور اس کے خاندان کو اس قابلِ رشک عہدہ سے محروم کر کے خود اس پر قابض ہو گیا۔[1]

اس انقلاب کے بعد عمرو بن لحی پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا اور اس بیماری نے بڑی سرعت کے ساتھ شدت اختیار کی۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں کسی حکیم و دانا نے اُسے بتایا کہ شام میں البلقاء کے مقام پر گرم پانی کا ایک چشمہ موجود ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر اُس کے پانی سے غسل کرے تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس نے اس مشورے کو پوری خوشدلی سے قبول کیا اور البلقاء کے لیے رختِ سفر باندھا۔ قدرت کو اس کی صحت منظور تھی، چنانچہ اُس نے جب اس چشمے کے پانی سے غسل کیا تو جلد شفا یاب ہو گیا۔

صحت بحال ہو جانے کے بعد اُس نے کچھ دنوں کے لیے وہاں مزید قیام کیا تاکہ اُس کی قوت و توانائی معمول پر آجائے اور وہ آسانی کے ساتھ سفر کے مصائب اور صعوبتوں کو برداشت کر سکے۔ اس عرصۂ قیام میں اُس نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اُن کے حضور سرِ نیاز خم کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات و سکنات سے

[1] کتاب الاصنام ص۸

وہ پہلے قطعاً شناسا نہ تھا۔ اُس کے دل میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان کے بارے میں اُن سے استفسار کرے۔ جستجو کرنے پر اُسے بتایا گیا کہ یہ ان کے معبود ہیں جن کی طرف وہ بارش اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ عمرو بن لحی نے ان سے درخواست کی کہ پتھر کے کچھ معبود اُسے بھی دے دیئے جائیں۔ چنانچہ ابقا کے باشندوں نے اس کے اس مطالبہ کے احترام میں چند بُت اس کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیئے۔ یہ شخص پتھر کی ان مورتیوں کو لے کر مکہ واپس چلا آیا اور انہیں خانہ کعبہ کے ارد گرد رکھ دیا[۱]۔

اسی سلسلہ میں ابن عباس سے جو روایت منقول ہے وہ یہ ہے کہ قبیلہ جُرہم سے تعلق رکھنے والے ایک شخص اِساف اور ایک عورت نائلہ کے درمیان سرزمین یمن میں معاشقہ شروع ہوا۔ حج کے موسم میں یہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ جب وہ اللہ کے مقدس گھر میں داخل ہوئے تو اتفاق سے اُس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے مُنہ کالا کیا۔ اس ذلیل اور مذموم حرکت کی وجہ سے اُن پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑی اور وہ بے جان پتھروں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ لیکن عربوں کی "ذہانت" کی داد دیجیے کہ انہوں نے ان سے عبرت پکڑنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی۔ خزاعہ اور قریش کے قبائل اس معاملے میں پیش پیش تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اولادِ اسماعیلؑ میں سے پہلا شخص جس نے بت پرستی کی رسم کو رواج دیا اور لوگوں کو اپنی اولاد کے نام بتوں کے ناموں پر رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوا وہ ہذیل بن مُدرکہ تھا۔

عرب کے مشہور بُت اور بتکدے ذیل میں ہم عرب کے مشہور بتوں اور بتکدوں کے نام اور ان کے مختصر حالات درج کرتے ہیں:

قبیلۂ ہُذیل سُواع کا پرستار تھا اور اس بُت کو اہلِ قبیلہ نے مدینہ کے ایک گاؤں یَنبع

---

[۱] کتاب الاصنام ص۸۔

کے نزدیک "بر حاط" کے مقام پر نصب کر رکھا تھا۔ اس صنم خانہ کی تولیت بنو لحیان کے سپرد تھی۔
قبیلہ کلب کے لوگ وَدّ کے سامنے اظہارِ عبودیت کرتے تھے۔
اسی طرح عرب کے دو مشہور قبائل مَذحج اور اہلِ جُرَش یَغوث سے وابستہ تھے۔
اِن بتوں سے ان قبائل کی عقیدت کا اظہار بعض اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

حَیّاکِ وَدٌّ! فَاِنّا لا یَحِلُّ لَنا
لھو النساء، وان الدین قد عزما

"اے ودّ تمہیں حیات دجاوداں نصیب ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم عورتوں کے ساتھ دل بہلائیں۔ ہمارا دین پختہ اور مضبوط ہے"۔

قبیلہ خیوان کے لوگ یعُوق کے حضور میں سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ ابن کلبی کے قول کے مطابق اُسے کسی ایسے قبیلے کا ذکر نہیں ملتا جس کے افراد نے اپنے نام اِس بت کے نام پر رکھے ہوں۔ اسی طرح اس بت کا تذکرہ شعراء کے کلام میں بھی ناپید ہے۔ اس کی وجہ ابن کلبی کے نزدیک یہ ہے کہ خَیوان، ہمدان اور اسی طرح کے دوسرے قبائل چونکہ صنعاء کے قریب آباد تھے اور حِمیَر سے اختلاط کی وجہ سے انہوں نے یا تو یہودیت کو قبول کر لیا تھا یا اُس سے کافی متاثر تھے، اس لیے انہیں اس بُت سے کوئی گہری وابستگی باقی نہ رہی تھی۔ یہ سرد مہری ہمیں قبیلہ حمیر کے افراد میں اُن کے بت "نسر" کے بارے میں بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ قبیلہ تُبّع کے عہدِ حکومت میں بُت پرستی کو ترک کر کے دینِ موسوی میں داخل ہو گیا تھا۔

دینِ موسوی میں داخلے سے قبل حِمیَر نے صنعا کے مقام پر ایک صنم کدہ تعمیر کر رکھا تھا جو ریام کے نام سے اہلِ عرب میں مشہور تھا۔ لوگ اس کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے، یہاں آکر نذرانے چڑھاتے اور بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دیتے تھے۔

یہ صنم کدہ مکر و فریب کی آماجگاہ تھا جس میں سادہ لوح عوام کو اُن کی ضعیف الاعتقادی

سے فائدہ اٹھا کر مختلف قسم کے فریب دیئے جاتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب تبّع عراق کی مہم میں کامیاب ہو کر اپنے مستقر پر واپس لوٹا تو اس نے دو مذہبی رہنماؤں کی مدد سے اس بتخانہ کو نیست و نابود کروا دیا۔ اس لیے قدیم عرب شاعری میں ریام اور نسر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا

یہ پانچ بت یعنی وَدّ، سُواع، یغوث، یَعوق، اور نسر جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے، قومِ نوح کے نہایت معظّم و محترم اصنام تھے۔ ان سے اُسے گہری وابستگی تھی اور وہ اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے زیادہ تر انہی کی طرف رجوع کرتی تھی۔ قرآن مجید میں ان بتوں کی پرستش کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا ۝ وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا ۝ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ۝ وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا۔

(نوح۔ آیت ۲۱-۲۴)

نوح نے کہا اے میرے پروردگار ان لوگوں نے میری نافرمانی کی اور اُن کی پیروی کی جن کے مال اور اولاد نے انہیں سوائے نقصان کے اور کچھ نہ دیا اور جنہوں نے بُری بُری تدبیریں کیں اور جنہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں، یعنی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ ان لوگوں نے بہتوں کو گمراہ کر دیا۔

یہ پانچوں بت یعنی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر عمرو بن لحی کی وساطت سے عربوں میں مقبول ہوئے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصنام غیر ملکی تھے جنہیں باہر سے پرستش کے لیے درآمد کیا گیا تھا۔

عربوں کے قومی بُت | عربوں کے قومی بتوں میں مَناۃ کی شہرت بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ صرف اس بت کی پورے جذبۂ عبودیت کے ساتھ پرستش کرتے، بلکہ عقیدت اور احترام کی وجہ سے اپنی اولاد کو ایسے ناموں سے پکارتے جو ہر لحاظ سے اُن کی اس بت کے ساتھ گہری وابستگی

کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ عربی ادب میں ہمیں اس قسم کے کئی نام ملتے ہیں جن میں عبد مناۃ اور زید مناۃ خاص طور پر مشہور و معروف ہیں۔ یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان مُشلّل کے قرب و جوار میں قُدَید کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔

اس بُت کی قریب قریب سارے عرب قبائل میں پرستش ہوتی تھی اور اس کی خوشنودی کے حصول اور اس کی ناراضگی سے بچنے کے لیے عرب جانوروں کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ مگر اس معاملے میں اوس اور خزرج سب پر سبقت لے گئے تھے۔ ابن کلبی، عمار بن یاسر کا، جو اوس اور خزرج کے معاملات کے متعلق سب سے زیادہ اور مستند معلومات رکھتے تھے، ایک قول نقل کرتے ہیں جس سے ان قبائل کی مناۃ کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

"یہ لوگ جب حج کی غرض سے دوسرے حجاج کے ساتھ روانہ ہوتے تو وہ تمام اُن مقامات پر ٹھہرتے جن پر کہ عرب عام طور پر قیام کیا کرتے تھے اور وہ ساری رسوم ادا کرتے جو اُس وقت رائج تھیں لیکن وہ اپنے سروں کو منڈانے سے اجتناب کرتے۔ واپسی پر جب وہ اس مقام پر پہنچتے جہاں مناۃ کا بُت نصب تھا تو وہاں کچھ وقفہ کے لیے قیام بھی کرتے اور اپنے سر بھی منڈاتے کیونکہ ان کے نزدیک مناۃ کی زیارت بھی حج کا ایک نہایت ضروری حصہ تھا اور جب تک اس رکن کو پوری طرح ادا نہ کیا جاتے اُس وقت تک اُن کی نظر میں حج کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔"

اس بُت اور اس سے عربوں کی غیر معمولی عقیدت اور وابستگی کا ذکر قرآن مجید میں یوں آتا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى - اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى - تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى - (النجم - رکوع ۱)	کیا تم نے لات اور عزّیٰ اور تیسرے منات کے حال میں غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ اس اعتبار سے تو یہ بُری بے ڈھنگی تقسیم ہے

عربوں کے ہاں مناۃ کی عرصہ دراز تک تعظیم و تکریم ہوتی رہی یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھویں صدی ہجری میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ اسے یکسر مسمار کروا دیا۔ اس مہم میں مسلمانوں کو کافی مال و اسباب ملا جس میں وہ دو تلواریں بھی شامل تھیں جو شاہ غسان حارث بن ابی شمر نے مناۃ کے حضور میں بطور نذرانہ پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک تلوار کا نام مخذم اور دوسری کا "رسوب" تھا۔ ان تلواروں کا تذکرہ علقمہ نے ایک شعر میں اس انداز سے کیا ہے:-

مظاهر سِر بالی حدید علیهما

عقیلا سیوف : مخذمٌ ورسوبٌ

"زرہ بکتر پہننے کے ساتھ ساتھ اس نے دو مرصع تلواریں بھی یعنی مخذم اور رسوب بھی سجا رکھی تھیں"

حضور سرورکائنات نے یہ دونوں تلواریں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمائیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ انہی میں سے ایک تلوار کو حضور سرور دو عالمؐ نے ذوالفقار کے نام سے موسوم فرمایا تھا۔

لیکن اسی سلسلہ میں ایک دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب حضورؐ نے "فلس" کی مہم پر روانہ کیا تو اس وقت طئی کے صنم کدے سے یہ تلواریں امیرالمومنین کے ہاتھ آئیں۔

مناۃ کے علاوہ عربوں کا دوسرا واجب التعظیم بُت اللات تھا، جس نے طائف کی سرزمین میں کفر و شرک کی ظلمتیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس صنم کدے کی تولیت ثقیف والوں کے سپرد تھی جن میں عتاب بن مالک کا خاندان سب سے نمایاں تھا۔ لات کا بُت بھی مناۃ کی طرح عرب کے سارے قبائل میں معظم اور مکرم تھا اور لوگ خیر و برکت کے حصول اور آسمانی اور ارضی آفات سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کے نام اس بُت کے نام پر رکھتے تھے۔ اسلام سے قبل کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ "زید اللات" اور

تیم اللات" زبان زد عام نام تھے۔

طائف کے میدان میں جو مسجد آج موجود ہے اس کے بائیں مینار کے بالکل ساتھ ہی کبھی یہ بُت نصب تھا۔

عرب کی جاہلی شاعری میں ہمیں بے شمار مقامات پر اس بُت اور اس سے لوگوں کی عقیدت و محبت کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً عمرو بن الجُعَیْد نے اپنے ایک شعر میں لات کا ذکر یوں کیا ہے:

فَاِنِّی وَتَرْکِی وَصْلَ کَاْسٍ لَکَالَّذِی
تَبَرَّاَ مِنْ لَاتٍ وَکَانَ یَدِیْنُھَا

"یہ ترکِ شراب بلا شبہ اُس شخص کی مانند ہے جو لات سے بیزاری کا اظہار کرے درآنحالیکہ وہ اسے اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔

لات کا بُت ایک مدّت دراز تک عربوں، خصوصاً اہلِ طائف کی عقیدت کا مرکز و محور رہا۔ پھر جب ۹ھ میں بنو ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو اس صنم کدے کے انہدام کے لیے بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے اسے منہدم کر دیا۔

جس وقت شرک اور بُت پرستی کے اس مرکز کا استیصال کیا جا رہا تھا اس وقت شداد بن عارض الجشمی نے ثقیف والوں کو مخاطب کر کے بآوازِ بلند فرمایا:

لا تنصروا اللات ان اللہ مھلکھا
وکیف نصرکم من لیس ینتصر

ان التی حُرِّقَت بالنار فاشتعلت
ولم تقاتل لدیٰ احجارھا، ھَدَر
ان الرسولَ متیٰ ینزِل بساحتِکُم

یَظْعَنُ وَلَیْسَ بِہَا مِنْ اَھْلِہَا بَشَرٗ

"لات کی مدد نہ کرنا، کیونکہ لات کو برباد کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کی قسمت میں کامیابی نہ ہو، تمہاری مدد سے کیا ہو گا۔ جو چیز آگ میں بھسم ہو کر راکھ ہو گئی اور اپنی کوئی مدافعت نہ کر سکی وہ یقیناً ناکارہ شے ہے۔ جب حضورؐ سرورِ عالم آپ کی سرزمین میں اپنے مبارک قدم رکھیں گے اور پھر یہاں سے واپس تشریف لے جائیں گے تو ایک متنفس بھی لات کا حامی نہ ہو گا۔"

اہلِ عرب کی تیسری مشہور دیوی[1] کا نام عزّٰی تھا۔ اس کی پرستش لات و منات کے بعد شروع ہوئی۔ جاہلی ادب کی تاریخ اس حقیقت کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ اس دیوی کے نام پر عربوں نے اپنی اولاد کے نام بہت بعد میں رکھنے شروع کیے تھے۔ چنانچہ عبد العزّٰی جیسا مرکب اسم پہلے دور میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا تذکرہ عام طور پر اُن شعراء کے کلام میں ملتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے ذرا پہلے پیدا ہوئے۔

عزّٰی کی پرستش کا آغاز ظالم بن اسعد کے ہاتھوں ہوا۔ مکہ سے جو راستہ عراق کی طرف جاتا ہے اس پر بستان سے نو میل کے فاصلہ پر سڑک کے دائیں جانب اس دیوی کا بت نخلۃ الشامیہ کے مقام پر جسے حُراض بھی کہتے ہیں، نصب تھا۔ اس بُت کے ارد گرد ایک وسیع عمارت تعمیر کی گئی تھی، جسے بُسّ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس عمارت میں اس دیوی کے حضور میں نذرانے پیش کیے جاتے، اس کی پرستش ہوتی اور غیب سے پُر اسرار آوازیں سنانے کے عجیب و غریب انتظام کیے جاتے تھے۔

اس دیوی کا وقار اور احترام مسلسل بڑھتا رہا۔ لوگوں نے دوسرے ناموں کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ اپنی اولاد کے نام اسی دیوی کے نام پر رکھنے شروع کیے، چنانچہ ایک ایسا وقت بھی آیا جب سب سے زیادہ مقدس نام عبد العزّٰی خیال کیا جانے لگا۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس نے اس

---

[1] حقیقت میں لات و منات بھی ان کی دیویاں ہی تھیں۔

بُت کی بندگی پر فخر نہ کیا ہو۔ لیکن اس معاملے میں جتنی فدائیت اور جاں نثاری قریش کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے اُس کی نظیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

عرب کے اس سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر قبیلے کے افراد کعبہ کے گرد طواف کرتے وقت اس بُت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کرتے:

واللات والعزیٰ۔ ومناۃ الثالثۃ الأخریٰ۔ فانھن الغرانیق العُلیٰ۔
وانّ شفاعتھن لتُرتجیٰ۔

”قسم ہے لات و عزّیٰ کی، اور ان دو کے علاوہ تیسرے منات کی، یہ حسین و جمیل رفیع الشان لڑکیاں ہیں، انہی سے شفاعت کے لیے التجا کی جاتی ہے“

ان تینوں بتوں یعنی لات، مناۃ اور عزّیٰ کو اہلِ عرب خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ ان کی شفاعت کے بغیر وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید نے بڑے زور دار الفاظ میں اُن کے اس باطل عقیدہ کی تردید کی ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى۔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى۔ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا

کیا تم نے لات، عزّیٰ اور تیسرے منات کے حال پر غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے۔ یہ نرے نام ہی نام ہیں جنہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرا لیا ہے خداوند تعالیٰ نے تو کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ یہ لوگ بے بنیاد خیالات اور اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا انسان کی ہر خواہش اور تمنا پوری ہو جاتی ہے۔ سو اللہ ہی کے اختیار میں ہے دنیا اور آخرت

اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَرۡضٰی ۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی ۔ (النجم۔ رکوع ۲۰۱)	اور بہت سے فرشتے جو آسمانوں میں موجود ہیں اُن کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر اللہ تعالیٰ جس کے معاملے میں چاہیں اور جس سے راضی ہوں اجازت فرمادیں۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔

قُریش نے حُراض کے قریب ایک پُوری وادی جسے سُقام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، عُزّٰی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس وادی کو یہ لوگ بڑی عزت و توقیر سے دیکھتے اور اسے خانۂ کعبہ کا ہی ایک حصّہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ عُزّٰی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس "وقف" کا ذکر بھی عربی اشعار میں کئی جگہ ملتا ہے۔ ابو جندب الھذلی اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے عُزّٰی اور سقام دونوں کی طرف اپنے ایک شعر میں یُوں اشارہ کرتا ہے:

لَقَدْ حَلَفْتُ جَهْدًا بِمِيْنًا غَلِيْظَةً
لِفَرْعِ الَّتِي أَحْمَتْ فُرُوعَ سُقَامِ

"اُس نے اُس ذات کی پختہ اور سچی قسم کھائی جس کے لیے سقام کی وادی وقف کی گئی تھی۔"

اسی طرح درہم بن زید الاوسیٰ نے ایک شعر میں کہا ہے۔

انی و رب العزی السعیدہ
واللہ الذی دون بیتہ سرف

"خوش بخت عُزّٰی کے رب کی قسم، اس اللہ کی قسم جس کے گھر اور سقام کے درمیان سَرِف موجود ہے۔"

عُزّٰی کے صنم کدے میں ایک قربان گاہ بھی تھی جسے غبغب کہا جاتا تھا اور جہاں زائرین ہدیے

کے جانور لاکر ذبح کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے :۔

لَقَدْ اُنْکِحَتْ اَسْمَاءُ لَحْیَ بُقَیْرَۃٍ
من الاُدْمِ اھداھا امْرُؤٌ من بنی غَنَم
رأیٰ قَذَعًا فِی عَیْنِھَا اِذْ یَسُوْقُھَا
اِلیٰ غَبْغَبِ الْعُزّٰی، وضع فِی اقسم

"اسماء کا نکاح اس بچھڑی کے جبڑے سے کر دیا گیا جسے بنی غنم کے کسی شخص نے چڑھاوا دیا تھا۔ اور جب وہ اسے غبغب عزّیٰ کی جانب لے جا رہا تھا اور اسے تقسیم کے لیے کاٹا تو اس وقت اُسے اس کی آنکھ میں عیب نظر آیا"

عزّیٰ کا صنم کدہ عربوں کے ہاں کتنا مشہور و مقبول اور کس قدر واجب التنظیم تھا اس کا ہلکا سا اندازہ قیس بن الحدادیۃ الخزاعی کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے :

تَلَبِنَّا بِبَیْتِ اللّٰہِ اَوَّلَ حَلْفَۃٍ
وَاِلَّا فَاَنْصَابٍ یَسُرْنَ لِغَبْغَبِ

"ہم سب سے پہلے قسم اللہ کے گھر کی کھاتے ہیں لیکن اگر وہ موثر نہ ہو تو پھر اُن مقدس پتھروں کی جو غبغب کے مقام پر نصب ہیں۔"

اس امر کا فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ لات، مناۃ اور عزّیٰ میں عربوں کے نزدیک کونسی دیوی سب سے زیادہ قابلِ تکریم تھی لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قریش کو عزّیٰ سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا اور وہ اس کی عزت و تکریم کو اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے۔

زید بن عمرو بن نفیل کا شمار اُن سعید روحوں میں ہوتا ہے جن کی فطرت سلیم نے انہیں بُت پرستی سے اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہی بیزار کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بُت پرستی کی پُر زور مذمت کی ہے اور اس سے براءت کا کھلے بندوں اظہار کیا ہے۔ اُن کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات بڑی آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ حضور سرورِ کائنات

کی بعثت سے پہلے عربوں کی عقیدت کے کون کون سے مرکز و محور تھے اور وہ کن آستانوں پر اپنی جبینِ نیاز جھکا کر اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں زید بن عمرو بن نفیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترکت اللات والعزّٰی جمیعًا
کذالک یفعل الجلدُ الصبور
فلا العزّٰی ادین ولا ابنتیھا
ولا صنمی بنی غنم ازورُ
ولا ھُبلًا ازورُ وکان ربًّا
لنا فی الدھرِ اذ حِلمی صغیرٌ

"میں نے لات اور عزّٰی دونوں کی پرستش سے منہ موڑ لیا ہے اور جری اور بہادر آدمی اسی طرح کرتا ہے۔ میں اب نہ تو عزّٰی کا پرستار ہوں اور نہ ہی اس کی دونوں بیٹیوں کا۔ میں بنی غنم کے دونوں بتوں کی بھی زیارت نہیں کرتا۔ میں ہُبل کی زیارت اور اس کی پرستش کے لیے بھی نہیں جاتا حالانکہ جب میں سنِ بلوغ کو نہ پہنچا تھا اس وقت ہم اسے اس دنیا میں اپنا رب تصور کیا کرتے تھے۔"

عزّٰی کے صنم کدے کی تولیت عرصۂ دراز تک مجموعی طور پر بنی سُلیم کے پاس رہی لیکن اس بُت خانہ کی حفاظت اور دربانی میں بنو شیبان پیش پیش تھے اور اس کام کو اپنے لیے ایک غیر معمولی اعزاز سمجھ کر اسے بڑے خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔

اس کی پرستش بھی دوسرے بتوں کی طرح حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جاری رہی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بربادی کا حکم صادر فرما دیا۔ اس دیوی کے بارے میں عربوں کے جذبات کتنے نازک تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی کتنی گہری تھی اس کا اندازہ اُس صدمے سے لگایا جا سکتا ہے جو انہیں اس کی مذمت سے پہنچا۔ سورہ النجم کی مشہور آیت

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى جب نازل ہوئی تو اس سے کفار کو شدید اذیت ہوئی اور اس کے نتیجے میں ابو احیحہ (عبدمناف کا پڑپوتا) سخت بیمار پڑ گیا۔ یہی بیماری بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ابولہب اُس کی عیادت کے لیے اُس کی خدمت میں پہنچا تو اُس نے اُسے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھا۔ ابولہب نے ابو اُحیحہ سے کہا "کیا تو موت سے خوفزدہ ہو کر آنسو بہا رہا ہے، حالانکہ اس سے کوئی مفر نہیں"۔ اس پر ابو احیحہ نے جواب دیا: نہیں مجھے موت کا قطعاً کوئی خوف نہیں اور اس کی وجہ سے میں بالکل پریشان نہیں البتہ مجھے صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد عزّٰی کی پرستش ختم ہو جائے گی۔ ابولہب نے اُسے تسلی دی اور کہا "یہ محض تمہاری خام خیالی ہے کہ عزّٰی کی تعظیم و تکریم یا اُس کی پرستش تمہاری ذات سے وابستہ ہے اور اس بنا پر یہ صرف تمہاری زندگی تک محدود رہے گی اور تمہارے چلے جانے کے بعد لوگ اس دیوی سے منہ موڑ لیں گے"۔

ابو اُحیحہ نے جب یہ الفاظ سنے تو اسے بڑی مسرت ہوئی کہ عزّٰی سے عربوں کو خاص طور پر ابولہب کو غیر معمولی عقیدت اور وابستگی ہے۔

رسائل و مسائل

ام المومنین حضرت سودہؓ کی تزویج اور اس کے مصالح پر مزید بحث

سوال ۔ اگست کا ترجمان ابھی نظر سے گزرا ۔ رسائل و مسائل حضرت سودہؓ کے متعلق آپ کا جواب قابلِ ستائش ہے ۔

توجیہہ واقعات میں مؤلفین عموماً واقعہ کے خلا کو اپنے ذہن سے پورا کرتے ہیں ۔ اور اکابر امت کے کردار کو خیالی اور مثالی رنگ میں پیش کر کے اپنی عقیدت کا اظہار اور قاری کے جذباتِ پرستش کو ابھارا جاتا ہے ۔ قدرتی طور پر اس سے جذبہ اتباع سرد پڑ جاتا ہے ۔ آپ کے جواب میں بھی اس کی جھلک موجود ہے (صفحہ ۴۱۸ ، پر " چنانچہ " سے شروع ہونے والا پیرا اسی قسم کی توجیہہ پر مشتمل ہے ۔

حضرت سودہؓ سے نکاح کے وقت از روئے تحقیق تمام بنات بالغات تھیں وہ حضرت سودہؓ کی دیکھ بھال کی محتاج نہ تھیں ۔ حضرت سودہؓ اور ان کے خاوند قدیم الاسلام تھے ۔ مکی زندگی میں جو مصائب مسلمانوں پر ڈھائے گئے تھے ، ان کا شکار یہ میاں بیوی بھی تھے ۔ خاوند کی وفات کے وقت اس کے پانچ بچوں کا بوجھ حضرت سودہؓ پر تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ آنحضورؐ نے ازراہِ تالیفِ قلب اور بچوں کی سرپرستی کے لیے یہ نکاح کیا ہو ۔ یہ وجہ زیادہ قرینِ قیاس ہے ۔ اسی طرح " ازواجِ مطہرات کے تعلقات غایت درجہ محبت آمیز تھے " محض خراجِ عقیدت ہے ۔ تاریخ اور نفسیاتِ انسانی کے منافی ہے ۔

صفحہ ۴۱۹ پر دوسرے پیرے کی سطر ۳ میں مرقوم ہے " ان میں سے بعض راوی ابوالزناد

اور واقدی ہیں جو دونوں مجروح اور ناقابلِ اعتماد ہیں۔" ابو الزناد قاضی مدینہ تمام ائمہ رجال کے نزدیک ثقہ اور حجت ہیں۔ کسی نے بھی مجروح قرار نہیں دیا۔ امام بخاریؒ کے نزدیک تو اصح الاسانید ہیں ــ قال ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ ہے۔ اور آپ ابو الزناد کو ناقابلِ اعتماد فرما رہے ہیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

ہمیشہ یہ ضابطہ ملحوظ خاطر رکھیے، جب بھی سند پر گفتگو کرنی ہو تو کتبِ رجال سے رجوع فرمائیے اور نقل کرنے میں احتیاط برتیے۔ اکثر اغلاط محض نقل میں ہو جاتی ہیں۔ غالباً جہاں سے آپ نے یہ مضمون لیا ہے وہاں ابن ابی الزناد ہوگا۔ نقل کرنے میں ابن کا لفظ رہ گیا۔ ابن ابی الزناد (عبدالرحمٰن بن ابی الزناد) بھی مطلقاً واقدی کی طرح مجروح نہیں ہیں ان کے متعلق کتبِ رجال میں تصریح موجود ہے کہ یہ مدینے کے رہنے والے ہیں اور آخر عمر میں بغداد میں آ گئے تھے۔ وہ روایات جو مدینے کی رہائش تک بیان کی ہیں درست اور قابلِ اعتماد ہیں اور جو روایات بغداد کے زمانۂ قیام میں اُن سے مروی ہیں ان میں کلام ہے۔

بہرحال علمی تحقیق میں سہل انگاری پسندیدہ نہیں۔ آپ کے اس مضمون میں جو کمی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

جواب - میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے تحریر کردہ جواب کو بغور دیکھا اور جو پہلو آپ کو قابلِ تنقید نظر آئے ان سے مجھے مطلع فرمایا۔ "توجیہ واقعات میں خلا کو اپنے ذہن سے پُر کرنے اور اکابر امت کے کردار کو خیالی رنگ میں پیش کر کے اپنی عقیدت ظاہر کرنے" کی جو تعریض آپ نے فرمائی ہے، اس کا منشا میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔

مَیں نے سابق شائع شدہ جواب میں لکھا تھا کہ " حضرت سودہؓ سے نکاح کی ایک مزید وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد گھر میں چھوٹی چھوٹی صاحبزادیاں تھیں اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ ان کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے کوئی معمر خاتون بھی بیتِ نبوی میں ہوں"۔ اس پر آپ کا معارضہ یہ ہے کہ "اس وقت از روئے تحقیق تمام بنات بالغات تھیں اور حضرت سودہؓ کی دیکھ بھال کی محتاج نہ تھیں"۔ میں نے جو بات کہی تھی اس سے میرا مدعا یہ تھا کہ بناتِ طیبات میں سے بعض اس وقت تک ناکتخدا تھیں اس لیے حرم نبوی میں ایک سن رسیدہ زوجۂ مطہرہ کا ہونا قرینِ مصلحت تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آنحضورؐ کی صاحبزادیوں میں سے حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت خدیجہؓ کے عینِ حیات ہی ہو چکا تھا اور حضرت رقیہؓ کا نکاح بھی حضرت سودہؓ کی تزویج سے پہلے ہو چکا تھا لیکن حضرت امِ کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے اور حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے نہیں ہوا تھا یقیناً یہ دونوں نکاح حضرت سودہؓ کی تزویج اور ہجرت کے بعد ہوئے ہیں۔

حضرت ام کلثومؓ کا نکاح ۳ھ میں اور حضرت فاطمہؓ کا نکاح جنگِ بدر کے بعد اور غزوۂ احد سے پہلے (دو اور تین سن ہجری کے مابین) ہوا ہے۔ یہ خیال کرنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ لڑکیاں بالغ ہو جانے کے بعد دیکھ بھال اور تربیت کی محتاج نہیں ہوتیں۔ میرے خیال میں صحیح تر بات یہ ہے کہ بلوغ کو پہنچ جانے پر بھی بہت سے مسائل و معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں مادرانہ شفقت، نگہداشت اور رہنمائی کی حاجت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے یہی حقیقت ہے جس کی جانب میں نے اجمالی اشارہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں مزید یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی ہے تو آپ تنہا تھے۔ آپ کے اہل و عیال میں سے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ جب تک ان دونوں بہنوں نے ہجرت نہیں کی اور جب تک وہ پیچھے مکہ میں مقیم رہیں، وہ حضرت سودہؓ کی نگرانی اور دیکھ بھال سے مستغنی نہیں تھیں۔ اصحاب سیرت نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ کچھ عرصے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید ابن حارثہ کو مکے اپنے عیال کو لانے بھیجا، تو اس وقت حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ ام المومنین حضرت سودہؓ ہی کی ہمراہی اور

رفاقت میں مدینہ پہنچی ہیں۔ نکاح کی جو وجہ آپ نے بیان فرمائی ہے اور جو آپ کے نزدیک زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ اس سے مجھے بھی مطلق انکار نہیں۔ میں نے تو گزشتہ جواب میں اسے خود پہلے بیان کیا ہے۔ البتہ میرا گمان یہ ہے کہ دوسری مصلحت، جس کا میں نے ذکر کیا ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس نہ سہی، بالکل بعید از قیاس بھی نہیں ہے۔

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ یہ خیال کرنا "محض خوش عقیدگی اور تاریخ و نفسیات کے منافی ہے کہ ازواجِ مطہرات کے تعلقات غایت درجہ محبت آمیز تھے"۔ مجھے بھی اس امر سے انکار نہیں ہے کہ صحابہ و صحابیات رضوان اللہ علیہم بشری خصائص و مقتضیات سے مبرا نہ تھے اور میں ان واقعات سے بے خبر نہیں جو نتیجۃً ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود جب بحیثیتِ مجموعی ان کے باہمی تعلقات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ سب رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ اور فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا کے مصداق نظر آتے ہیں۔ لائقِ اعتبار شاذ حالات نہیں بلکہ عمومی حالات ہوتے ہیں۔ ازواجِ مطہرات کے حالات کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، اس سے میں نے تو یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کے مابین اگر کبھی عارضی شکر رنجی پیدا ہوئی ہے تو اس کا سبب باہمی منافرت یا عدمِ محبت نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے غیر معمولی وابستگی اور الفت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین اندازِ تربیت نے اس جذبۂ رشک کو بھی بہت بڑی حد تک رفع کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ واقعہ آپ کی نگاہ سے گزرا ہوگا کہ آنحضورؐ جب ایک بیوی کے ہاں تشریف فرما تھے تو دوسری بیوی نے وہاں کھانا بھجوایا۔ پہلی بیوی نے اٹھ کر کھانا لانے والی لونڈی کے ہاتھ کو ایسا جھٹکا دیا کہ برتن گر کر ٹوٹ گیا اور کھانا خاک میں مل گیا۔ آپ نے خادمہ سے فرمایا: "تمہاری ماں کو غیرت آگئی"۔ اور پھر جس بیوی کے ہاں مقیم تھے انہیں ہدایت فرمائی کہ اس سے بہتر کھانا اس سے بہتر برتن میں رکھ کر دوسرے گھر میں بھجواؤ۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس ارشاد کی تعمیل کی اور یوں یہ ناخوشگوار واقعہ ایک خوشگوار انجام پر ختم ہوا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں کبھی کبھار کی یہ ناچاقی بھی اسی وقت تک کے لیے تھی جب تک اس کے ازالے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امہات المومنین کے درمیان

موجود تھے۔ جب آپ کا وصال ہوگیا تو سب نقشیں اور رقابتیں بھی دفن ہوگئیں اور ازواج مطہرات کا یہ حال ہوگیا کہ وہ آپس میں بیٹھ کر اور اپنے بازو ایک دوسری سے ملا کر یہ دیکھا کرتی تھیں کہ کس کے بازو سب سے زیادہ لانبے ہیں، کیونکہ آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ سب سے پہلے وہ بیوی میرے پاس پہنچے گی جس کے بازو سب سے زیادہ طویل ہیں[1]۔

طبقات ابن سعد کے اسناد سے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس پر آپ کی تنبیہ بالکل بجا ہے اور میں اس کے لیے ممنون ہوں۔ ابوالزناد بلا شبہ بالاتفاق ثقہ ہیں اور بات وہی ہے کہ سہو قلم کی بنا پر ابن کا لفظ مجھ سے رہ گیا۔ دراصل ابوالزناد کے بجائے ابن ابی الزناد ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ میں نے پہلے ابوداؤد کی روایت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ ابن سعد کی ایک روایت میں عن الواقدی عن ابن ابی الزناد کے الفاظ ہیں۔ دوسری مرسل روایت میں سعید بن منصور عن ابن ابی الزناد کے الفاظ ہیں اور حضرت عائشہ کا نام مذکور نہیں ہے۔ زیر بحث اور متنازعہ فیہ راوی ابن ابی الزناد ہی ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہے کہ ابن ابی الزناد کی بعض روایات میں کلام ہے گو وہ بغداد کے زمانۂ قیام ہی سے متعلق ہوں۔ اب اس وقت میرے لیے یہ چھان بین کرنا مشکل ہے کہ اس راوی کی وہ مرویات جن میں طلاق کا ذکر ہے، مدینہ کے دور کی ہیں یا بغداد کی لیکن امام زکی الدین منذری نے چونکہ طلاق والی روایت ہی کے سباق میں اس راوی کا متکلم فیہ ہونا بیان کیا ہے، اس لیے اغلب یہی ہے کہ یہ روایت بغداد کے دورِ قیام کی ہے۔ آپ اس امر سے بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ محدثین کا ایک گروہ اگر ایک راوی کو عادل ٹھہرائے اور دوسرا گروہ اس پر جرح کرے تو جمہور کے مسلک کے مطابق تجریح کو تعدیل پر مقدم ٹھہرایا جائے گا اور روایت قبول کرنے میں توقف کیا جائے گا۔

---

[1] یہ دراصل ایک استعارہ تھا، جسے ازواج مطہرات نے لغوی معنوں پر محمول کیا تھا۔ بعد میں جب ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ کا انتقال سب سے پہلے (وصال نبوی کے دو ماہ بعد) ہوا، تو یہ راز کھل گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کا مصداق وہی تھیں۔ کیونکہ وہ سخاوت اور غریب پروری میں ید طولیٰ رکھتی تھیں اور اسی لیے ان کا لقب ام المساکین مشہور ہو گیا تھا۔ (غ۔ ع)

بہر حال واقعۂ طلاق یا ارادہ طلاق کو تسلیم کرنے میں میرے تامل و تردد کا دارومدار فقط ایک دو راویوں کی ثقاہت یا عدم ثقاہت پر نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد وجوہ ہیں، جن میں سے ایک بڑی وجہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، یہ ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے صحیحین میں وہ روایات تو لے لی ہیں جن میں حضرت سودہؓ کے حضرت عائشہؓ کو اپنی باری سپرد کرنے کا ذکر ہے لیکن وہ روایات ترک کر دی ہیں جن میں طلاق کا بیان آیا ہے۔ میں نے بعض دیگر اشکالات کا ذکر سابق جواب میں کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ بیان ہے کہ مستشرقین نے اس طلاق کے مسئلے میں خاصی دلچسپی ظاہر کی ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں جو مقالہ حضرت سودہؓ سے متعلق ہے، اس میں صحیحین و سنن کی تو کسی روایت کا نوٹس تک نہیں لیا گیا لیکن ابن سعد کے حوالے سے یہ بات اہتمام سے درج ہے کہ حضرت سودہؓ کو طلاق دی گئی تھی۔

آپ کا یہ مشورہ بہت صائب اور قابلِ قدر ہے کہ علمی مسائل میں سہل انگاری نہیں برتنی چاہیے۔ میں پہلے بھی اس کے مطابق عمل کی سعی کرتا ہوں، آئندہ انشاء اللہ مزید احتیاط سے کام لوں گا۔

مطبوعات

تذکرہ علمائے ہند | تالیف: مولوی رحمٰن علی مرحوم ومغفور۔ ترتیب وترجمہ: جناب محمد ایوب قادری صاحب۔ صفحات: ۷۰۸۔ قیمت: پندرہ روپے۔

علمائے پاک وہند کی دینی خدمات اور اُن کے حالات زندگی کے تذکرے یوں تو کئی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں مگر یہ تذکرے عام طور پر مقامی علماء کے حالات پر مشتمل ہیں۔ ایسی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آئی ہیں جن میں اس برصغیر کے علماء کے حالات یکجا مدون کیے گئے ہوں۔ اس نوعیت کے صرف دو تذکرے مشہور اور متداول ہیں۔ ایک مولانا حکیم عبدالحئی لکھنوی مصنف "گل رعنا" کی قابل قدر عربی تصنیف "نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر" جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ دوسری مولوی رحمان علی مرحوم کی زیر نظر کتاب "تذکرہ علمائے ہند" جسے فاضل مصنف نے فارسی میں مرتب کیا تھا یہ کتاب ۱۳۰۵ھ (۸۸۷-۱۸۹۱ء) میں لکھی گئی اور اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں اسے مشہور مطبع نول کشور نے شائع کیا۔ اب پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی اشاعت کا انتظام کیا ہے۔

اس کے ترجمے ترتیب اور حواشی لکھنے میں محمد ایوب قادری صاحب نے جس محنت، جانفشانی اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے صرف ایک چیز ذہن میں کھٹکتی ہے کہ اس میں فاضل مرتب نے اس غیر جانبداری کو ملحوظ نہیں رکھا جو ایک تذکرہ نگار کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ چونکہ مولوی رحمان علی صاحب مرحوم اپنے معاصر علمائے بدایوں اور بریلی سے حد درجہ متاثر تھے اس لئے دوسرے مکاتیب فکر کے علماء کا ذکر یا تو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے یا اگر کیا بھی گیا ہے تو دو چار سطروں میں محدود ہو کر

رہ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے مکتب فکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ کسی قدر کد تھی۔ اسی وجہ سے پاک و ہند کے بعض نامور علماء جن کی مقدس زندگیاں مسلمانانِ پاک و ہند کا بیش قیمت ورثہ ہیں، یعنی سید احمد شہیدؒ اور ان کے جانثار رفقاءِ کار کا اس کتاب میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔

فاضل مترجم نے ہجری سنین کی عیسوی سنین سے مطابقت کر کے اور حواشی میں ۴۲ علماء و مشاہیر کے حالات مزید شامل کر کے، کتاب کی افادیت میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں کتابیات اشاریہ اور تکملہ بھی شامل ہیں۔ اشاریہ بڑا جامع ہے اور اسے اماکن، کتب اور اعلام کے اعتبار سے الگ الگ مرتب کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پاک اکیڈیمی ۱/۴۱ وحید آباد کراچی نمبر ۱۸ سے مل سکتی ہے۔

تفصیلی فہرست مخطوطات عربیہ

تفصیلی فہرست مخطوطات فارسیہ

ضمیمہ (۱) تفصیلی فہرست مخطوطات عربیہ

تفصیلی فہرست مخطوطات متفرقہ

(اردو، پنجابی، ہندی، کشمیری، ترکی، پشتو)

پنجاب پبلک لائبریری جو اس ملک کا نہایت قیمتی قومی ادارہ ہے اپنے پاس قلمی نسخوں کا بیش قیمت ذخیرہ بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ لائبریری کے ارباب اختیار کو بالکل صحیح طور پر اس امر کا احساس ہوا کہ اہل علم کو ان چھپے ہوئے خزانوں سے روشناس کرایا جائے۔

قلمی نسخوں کی تحقیق غیر معمولی قابلیت دقت نظر اور عرق ریزی چاہتی ہے۔ خوش قسمتی سے لائبریری کو ایک ایسے فاضل یعنی پروفیسر منظور احسن صاحب عباسی کی خدمات حاصل ہو گئیں جو اس کام کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ہیں۔ چنانچہ فاضل مرتب نے پیرانہ سالی کے باوجود اس کام کی تکمیل کے لیے

جس ریاضت، گہری لگن اور وسعتِ نظر کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنہیں اس طرح کے کاموں کے کرنے کا کبھی موقعہ ملا ہو۔

بشر کے ہاتھ سے جو کام بھی انجام پائے اسے خواہ کتنی محنت اور احتیاط سے کیا جائے مگر اس میں غلطی کا بہر حال امکان باقی رہتا ہے چنانچہ اس فہرست میں بھی کہیں کہیں اغلاط نظر آتی ہیں۔ مثلاً فہرست مخطوطات فارسی کے ص۲۴۷ پر کتاب انیس الارواح کا ذکر کرتے ہوئے اس کے مصنف حضرت معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو "یکے از صوفیائے اواخر صدی پنجم ہجری" لکھا گیا ہے یہ صحیح نہیں۔ ان کی وفات ۶۳۳ھ میں ہوئی اس لحاظ سے یہ پانچویں صدی کے نہیں بلکہ ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ پھر فاضل مرتب نے حضرت شاہ معین الدین اجمیریؒ کو حضرت خواجہ یوسف ناصر الدین چشتی بن محمد سمعان نور اللہ سرہم کا خلیفہ بتایا ہے یہ بھی محلِ نظر ہے۔ انہیں دراصل حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔

ان فروگذاشتوں کے علاوہ جو چیز ذوق پر گراں گذرتی ہے وہ طباعت کی غلطیاں ہیں۔ اس معاملے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ اس نوعیت کی کتاب میں اغلاط کی زیادتی نہ صرف ذوق پر گراں گذرتی ہے بلکہ کتاب کی افادیت کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ لائبریری کے اربابِ بست وکشاد اگلے ایڈیشن میں ان اغلاط کی اصلاح کی طرف پوری توجہ دیں گے۔

چاروں فہرستوں کی قیمت ۳۷ روپے ہے اور پنجاب پبلک لائبریری سے مل سکتی ہیں۔

تنقیدی ادب | مرتبہ جناب سردار مسیح گل صاحب ایم اے۔ ایم او ایل شائع کردہ ہ نذر سنز پبلشرز لاہور، کراچی، راولپنڈی۔ قیمت چھ روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۵۳۹

تنقید کسی گلشن میں کانٹوں کی تلاش نہیں بلکہ کانٹوں کی موجودگی کے باوجود بہار کا احساس ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ایک نقاد کے لئے وسعتِ مطالعہ اور ہمدردانہ مگر متوازن طرزِ فکر دو بنیادی خصوصیات ضروری ہیں۔ (ع۔ ف)

انگریزی ادب کی ترویج و ترقی کے باعث ہمارے فنِ تنقید میں بھی کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہمارے ناقدین نے اپنے ادبی سرمایہ کا نئے زاویوں سے جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ ان حضرات کی ان ذہنی کاوشوں کے نتائج مختلف ادبی رسائل اور کتب کے ذریعہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مرتب نے جو مسیحی جماعت کے ایک ہونہار نوجوان اور اردو فارسی کا نہایت شستہ ذوق رکھنے والے فاضل ہیں ۱۰ ان تنقیدی مقالات کو یکجا کر دیا ہے۔ اس انتخاب میں انہوں نے اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا ہے کہ تنقیدی ادب کے مختلف اصناف اور پہلوؤں کے متعلق ایسے مضامین یکجا ہو جائیں جن سے ان اصناف کا صحیح تعارف بھی ہو سکے اور اُن مخصوص پہلوؤں کی ایک واضح اور دلکش تصویر بھی سامنے آ جائے۔

فاضل مرتب نے ہزاروں صفحات میں بکھرے ہوئے مواد کو جس عرق ریزی اور دیدہ وری سے تلاش کر کے جس دقتِ نظر سے جانچ کر اور جس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے وہ لائقِ تحسین و ستائش ہے اور ان کی یہ کوشش اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ مجموعہ اگرچہ طلباء کی ضرورت کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس سے ہر صاحبِ ذوق تنقیدی شعور بیدار کرنے میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

اس کے مطالعہ سے ایک بات کا البتہ احساس ہوتا ہے کہ اگر فاضل مرتب اس مجموعے کو ادوار کے اعتبار سے ترتیب دیتے تو اس میں ایک معنوی نظم اور مقصدی ربط پیدا ہو جاتا جس سے اس کی افادیت بڑھ جاتی۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجموعہ وقیع اور عمدہ ہے اور مرتب کے وسعتِ مطالعہ اور سلجھے ہوئے ذوق کا ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ (ع - ح - ص)

تاریخ اسلام | مؤلف: سید عین الحق حقی ایم - اے - صدر شعبۂ تاریخ اسلام - اسلامیہ کالج کراچی - ناشر: علی بک ڈپو - ۴۵ - اردو بازار کراچی - قیمت: ساڑھے چھ روپے - صفحات: ۲۰۴

زیرِ نظر کتاب اسلام کی ایک مختصر تاریخ ہے جو خصوصیت کے ساتھ طلبہ کی خاطر لکھی گئی ہے اور عہدِ رسالت سے لے کر زوالِ بغداد تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں اُن

تہذیبوں اور مذاہب کا بھی مختصر جائزہ لیا گیا ہے جن کا بلاواسطہ تعلق اسلام اور مبدء اسلام سے رہا ہے۔ واقعات کے بیان میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ بہر حال یہ کتاب تاریخ اسلام کے ابتدائی درجوں کے طالب علموں کے لیے مفید ہے۔ کتاب کا معیارِ کتابت وطباعت اونچا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسودے کی نظر ثانی بھی بے توجہی سے کی گئی ہے۔ البتہ کاغذ اور جلد اچھے ہیں۔

اللہ جلّ جلالہ تصنیف: عباس محمود العقاد۔ ترجمہ: عبدالصمد صارم۔ ناشر: مکتبہ معین الادب لاہور۔ قیمت: ساڑھے آٹھ روپیہ۔ ضخامت: ۴۷۱ صفحات۔

عباس محمود العقاد مصر کے ممتاز ادیب اور صاحبِ تحقیق عالم ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے عقیدۂ الوہیت کے ارتقاء کا تاریخی جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے قدیم اقوام کے تصورِ خدا سے بحث کا آغاز کرنے کے بعد ازمنۂ وسطیٰ کی قوموں کے عقائد کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اہلِ کتاب اقوام کے عقائد اور فلاسفۂ متقدمین و متاخرین کے مذاہب پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر عقیدۂ الوہیت کے متعلق معاصر فلاسفہ کے افکار کا جائزہ لیا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر بحث و تلاش کا باب بند کرتے ہوئے انہوں نے مندرجۂ ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔ (ا) عقائدِ الٰہیہ میں توحید کا مقام اعلیٰ ترین مقام ہے اور یہ کہ توحید ہی انسان کی عقلی اور فطری صلاحیتوں کے لیے موزوں ترین چیز ہے۔ (ب) خدائے واحد ایک معین "ذات" ہے۔ اس کے سوا عقلاً ہر صورت غلط ہے۔ (ج) وہ ذات صاحبِ صفات ہے (جن کا کوئی شمار نہیں ہے) صاحبِ ارادہ ہے اور صاحبِ علم جزو و کل ہے۔ (د) عقل اور ایمان کے مابین ایک رشتہ ہے۔ تنہا عقل ذاتِ الٰہی کا ادراک نہیں کر سکتی لیکن عقل کے بغیر شرک و توحید میں امتیاز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کا ترجمہ جناب عبدالصمد صاحب صارم الازہری نے کیا ہے اور اچھا کیا ہے۔ اس طرح کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے جس علم و فضل کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے وہ بہرہ ور

ہیں۔ البتہ کتاب کا معیار کتابت وطباعت فروتر ہے۔

رسول نمبر ماہ نامہ خاتونِ پاکستان | مدیر: شفیق بریلوی۔ ہدیہ دس روپیہ۔ ضخامت: ۲۹۹ صفحات۔ پتہ: پوسٹ بکس ۱۹۹ ۷۔ صدر۔ کراچی ۳

ماہ نامہ "خاتونِ پاکستان" کراچی کے مُدیر جناب شفیق بریلوی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں اور ان کی اس عقیدت ومحبت کا اظہار ان کے سارے خاتونِ پاکستان کے متعدد رسول نمبروں سے ہوتا ہے۔ عشقِ رسول کے ساتھ ساتھ وہ ملت کا درد اور اصلاح کی تڑپ بھی اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرتب کردہ رسول نمبروں میں ایک مقصدیت کارفرما نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر رسول نمبر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کے ہر پہلو پر نہایت قیمتی مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں قدیم وجدید اور ملکی وغیر ملکی علماء فضلاء و صوفیاء و ادباء غرض ہر مشرب ومسلک کے بزرگوں کا اجتماع نظر آتا ہے جس سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ یہ امّت خواہ کتنے ہی اختلافات میں اُلجھی ہوئی کیوں نہ ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت ومحبت سب کے لیے سرمایۂ حیات ہے۔

اسلامی اصولِ صحت | مصنف: فضل کریم فاران بی۔ اے دعلیگ، ایل۔ ایل۔ بی۔ ناشر: ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور۔ قیمت: ساڑھے تین روپیہ۔ ضخامت: ۲۲۰ صفحات۔

دینِ فطرت نے جہاں ہمیں آدابِ بندگی سکھائے ہیں وہاں آدابِ زندگی بھی سکھائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحت وصفائی کے جو اصول مغرب نے اس بیسویں صدی میں عقل وتجربے کی مدد سے علوم وفنون کی روشنی میں معلوم کیے ہیں، ان سے کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ مکمل اصول اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، نے ہمیں آج سے چودہ سو برس پہلے سکھا دیئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم کا ایک ناخواندہ شخص بھی پاکیزگی وطہارت اور صحت وصفائی کا جو اہتمام رکھتا ہے، مغرب کے اچھے اچھے پڑھے لکھے افراد اس سے عاری نظر آئیں گے پھر فرق صرف اتنا ہی نہیں ہے، مغرب میں صحت و

صفائی کے صرف وہ اصول ملحوظ رکھے جاتے ہیں جن کا تعلق انسان کے حسن ظاہر سے ہے۔ صبح اٹھ کر باہر نکلنے سے پہلے منہ دھونا تو بلاشبہ ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر طہارت کرنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ ہمارے ہاں ہر کھانے کے بعد کلّی کرنا ضروری ہے لیکن اہلِ مغرب عام خوش حالی کے سبب سے سارا دن کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کے باوجود ایک دفعہ بھی کلّی نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ وہاں دانتوں کے امراض عام ہیں۔ مسیحیت میں جسمانی پاکیزگی عیاشی میں داخل رہی ہے، غسل کرنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا رہا ہے لیکن مسلمانوں میں قلب و روح کی پاکیزگی کے لیے جسم کا پاکیزہ ہونا شرطِ اوّل ہے۔

صحت و صفائی کے یہ اصول جو ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے سکھائے ہیں کتب حدیث و فقہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جناب فضل کریم صاحب تارانی نے انہیں بڑے سلیقے اور سلاست کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس طرح سے ایک عام اردو خواں شخص بھی آسانی سے ان اصولوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

مُرقّع کلامِ اقبال | تحقیق: عصمت عارف علوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ قیمت: دس روپیہ۔ پتہ: کوٹھی ۱۳۱ خیالی گنج کراسنگ لکھنؤ۔

اس برِ صغیر کے شعراء میں غالبؔ کے بعد سب سے بڑھ کر جس شاعر کے کلام کو قبول عام نصیب ہوا ہے وہ علامہ اقبالؒ ہیں۔ اس قبول عام کا اظہار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا ہے لوگوں نے ان شعراء کے کلام کی شرحیں لکھی ہیں۔ ان کے فلسفوں پر بحثیں کی ہیں، ان کی شعری اور فنی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے اور ان کی زندگیوں اور ان کے فن کے درمیان ربط تلاش کیا ہے۔ قبولِ عام کی دوسری شکل یہ رہی ہے کہ ان کے کلام کو بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے غالب کے کلام کے کیفی پہلوؤں کو مرقع تصویر میں پیش کیا گیا اور اب محترمہ عصمت عارف علوی صاحبہ نے علامہ اقبال کے کلام کا ایک انتخاب مرقع کلام اقبال کے نام سے اسی طرز پر شائع کیا ہے اس میں انہوں نے ہر نظم کے ایک ایک یا دو دو اشعار کو تصویر کے پیراہن میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

(بقیہ اشارات)

میں جس انقلاب کے برپا ہونے کا اندیشہ ظاہر فرمایا ہے اس کے متعلق میں پوری صفائی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ یہ ملک پے درپے انقلاب کے خطرے سے اُس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک یہاں لوگوں کو اپنے حکمران اپنی آزاد مرضی سے منتخب کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا، اور جب تک یہاں کے سرکاری ملازمین، فوجی اور سول دونوں یہ سبق نہیں سیکھتے کہ حکومت کرنا عوام کے اپنے چنے ہوئے نمائندوں کا حق ہے اور ملازمین کا کام یہ ہے کہ جو پارٹی بھی عوام کی مرضی سے برسرِ اقتدار آئے وہ ایمانداری کے ساتھ اس کے ماتحت اپنے فرائض انجام دیں۔ یہ سبق جب تک نہ سیکھا جائے گا، اور جب تک برسرِ اقتدار لوگ سرکاری ملازمین کو انتخابات جیتنے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے، اور جب تک اونچے درجے کے سرکاری افسروں کو یہ اصرار رہے گا کہ حکومت لازماً ان کی اپنی مرضی ہی کی بننی چاہیے، اس وقت تک ہمارے اس بدقسمت ملک میں انقلابی طوفان آتے رہیں گے۔"
